ماہنامہ

اِنذار

مدیر
ابویحییٰ

اپریل 2017ء

اطمینان رکھیے کہ مصیبت اور پریشانی سے
آپ کے درجات بلند ہوتے ہیں
اور اس بات پر اطمینان نہیں ہے تو تیار رہیں
آپ کا بلڈ پریشر بلند ہو جائے گا

www.inzaar.org

ماہنامہ

اِنذار

اپریل 2017ء رجب 1438ھ
جلد 5 شمارہ 4

ابویحییٰ کے قلم سے

فی شمارہ — 25 روپے
سالانہ: کراچی (بذریعہ کوریئر) 500 روپے
بیرون کراچی (نارمل پوسٹ) 400 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ)
بیرون ملک 2500 روپے
(زرتعاون بذریعہ پوسٹل بیئرر آرڈر یا ڈرافٹ)
نارتھ امریکہ: فی شمارہ 2 ڈالر
سالانہ 24 ڈالر

P.O Box-7285, Karachi.
فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

مشکل کیسے آسان ہوگی؟

اس دنیا میں انسانوں کے لیے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے پریشان ہوجاتے ہیں۔تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا میں مشکلات سے بچنا ممکن نہیں ہے۔مشکلات ان دو بنیادی چیزوں میں سے ایک ہے جن کا اس دنیا کے ہر انسان کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔دوسری چیز آسانیاں ہیں جو ہر انسان کو پسند ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس مسئلے کا کیا حل ہے۔ ہمارے اس مسئلے کا حل بہت سادہ ہے۔ وہ یہ کہ مشکلات کے بارے میں خدا کا منصوبہ سمجھا جائے۔مشکل خدا کی اسکیم میں دو مقاصد کی تکمیل کے لیے ڈالی گئی ہے۔ ایک یہ کہ عام حالات اور آسانیوں میں انسان کا ذہن پوری طرح فعال نہیں ہوتا۔لیکن جب مشکل آجاتی ہے تو انسان کا ذہن، دیگر اعضا کے ساتھ پوری طرح فعال ہوجاتا ہے۔ چنانچہ جو انسان مشکلات میں پریشان ہونے کے بجائے انھیں خدا کی اسکیم کا حصہ سمجھ کر بطور چیلنج لیتے ہیں، وہ اپنے ذہن اور صلاحیت کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ صلاحیت ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال دیتی ہے۔جس کے بعد انسان بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کرتا ہے۔چنانچہ مشکلات کو چیلنج سمجھنا ہی مشکلات سے نکلنے اور زندگی میں کامیابی کا راز ہے۔

مشکل کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ انسان آسانی میں خدا فراموش ہوجاتا ہے۔ یہ مشکل ہے جو انسان کو خدا سے قریب کرتی ہے۔انسان جو مقام بڑی سے بڑی عبادت سے حاصل نہیں کرسکتا وہ مشکل پر صبر کرنے اور اسے حوصلے کے ساتھ جھیلنے کے نتیجے میں حاصل کرلیتا ہے۔اس بات کو سمجھنے کی اس لیے بھی اہمیت ہے کہ انسان ہر حال میں ہر مشکل کا حل نہیں نکال سکتا۔لیکن جب وہ صبر کرتا ہے تو آخرت میں بڑے اجر کا حقدار ہوجاتا ہے۔

چنانچہ مشکل آنے پر گھبرانا نہیں چاہیے۔مشکل دراصل دنیا اور آخرت کی بھلائی کا نام ہے۔

I will ride with you

دسمبر 2014 میں سڈنی، آسٹریلیا میں دہشت گردی کا ایک واقعہ پیش آیا۔ ایک ایرانی مسلمان نے ایک کیفے کے ملازمین اور گاہکوں کو جن کی تعداد اٹھارہ تھی ،سولہ گھنٹے تک یرغمال بنائے رکھا۔ آخر کار دو مغویوں اور دہشت گرد کی ہلاکت کے بعد یہ معاملہ ختم ہوا۔ اس واقعہ کے آغاز پر جیسے ہی یرغمالی کے ایک مسلمان ہونے کی اطلاع عام ہوئی تو پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرنے والی ایک مسلمان خاتون خوفزدہ ہوگئی۔ اس نے اس خوف سے کہ کہیں مسلمان ہونے کی بنا پر اس کو نشانہ نہ بنایا جائے ، اپنا اسکارف اتار کر پرس میں رکھ لیا۔ ایک مقامی سفید فام خاتون نے اسے یہ کرتے دیکھا تو اس سے کہا کہ تم ڈرو نہیں۔ اپنا اسکارف پہنو۔ میں تمھارے ساتھ تمھارے گھر تک چلوں گی۔ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

گھر پہنچ کر سفید فام خاتون نے یہ واقعہ اپنے فیس بک پر لگایا۔ جس کے بعد پورے آسٹریلیا میں ایک مہم چل گئی جسے I will ride with you کا نام دیا گیا۔ یعنی کسی بھی مسلمان کو اگر یہ خطرہ محسوس ہو کہ اسے نشانہ بنایا جائے گا تو مقامی شخص اس کے گھر تک اسے پہنچا کر آئے گا۔ تقریباً ڈیڑھ لاکھ رضا کاروں نے اس مقصد کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔

درحقیقت مغرب اس وقت دنیا میں غالب ہے تو اس کی وجہ کوئی سازش نہیں جیسا کہ ہمارے ہاں پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ اہل مغرب میں اخلاقی طور پر بہت سی خوبیاں ہیں جو ہم میں نہیں ہیں۔ مگر ہماری لیڈر شپ نرگسیت کی مریض ہے۔ وہ قوم کی اصلاح کرنے کے بجائے نفرت پھیلا کر سستی شہرت حاصل کرنے کو لیڈری سمجھتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دو سو برس سے جاری ہمارا زوال ختم ہی نہیں ہو کر دیتا۔ ہمارا زوال اس روز ختم ہوگا جب ہم جان لیں گے کہ ہمارا اخلاقی زوال ہماری ذلت کا اصل سبب ہے نہ کہ کسی کی کوئی سازش۔

لبرلز کا مسئلہ

سوشل میڈیا کی مقبولیت کے بعد ہمارے ہاں دائیں اور بائیں بازو کی کشمکش عروج پر پہنچ چکی ہے۔ دائیں بازو کے لوگوں کا خیال ہے کہ بائیں بازو والے لبرل اور سیکولر طبقات پاکستان میں مغربیت، مغربی اقدار اور سیکولرازم کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان کا راستہ روکنا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ انہیں دشمن سمجھ کر ان کے خلاف زبردست جنگ جاری ہے۔

دائیں اور بائیں بازو کی بحث سے قطع نظر قرآن مجید اور پیغمبر علیہ السلام کے زاویے سے جب چیزوں کو دیکھا جاتا ہے تو وہاں کسی انسان کو نہیں بلکہ شیطان کو دشمن سمجھ کر اس سے مقابلہ کرنے کا ذہن بنایا جاتا ہے۔ انسانوں کو تو اپنے بھائی اور بہن سمجھ کر ان کی خیر خواہی کے جذبے سے درست بات ان تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ہمیں اپنے ہاں موجود لبرل طبقات کے ساتھ بھی اسی طرح معاملہ کرنا چاہیے۔ ان میں سے بہت کم لوگ ہیں جو اسلام کے حقیقی دشمن ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اسلام کی اصل دعوت ان میں سے بہت سے لوگوں تک نہیں پہنچی ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جن تک اسلام کا استدلال نہیں پہنچا ہے۔ انسانی تعبیرات کو جب اسلام کے نام پر پیش کیا جاتا ہے تو ان پر بہت سے جائز سوالات پیدا ہو جاتے ہیں، ایسے سوالات کا جواب دینا ضروری ہے۔

قرآن وسنت کی بنیاد پر دینی تعبیرات پر از سر نو غور وفکر وقت کا اہم چیلنج ہے۔ مگر اس کے بجائے دہشت گردی، فرقہ واریت، تنگ نظری، اختلاف رائے رکھنے والوں کو بدنام کرنا عرصہ دراز سے ہمارا وطیرہ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے نام پر جو کچھ اس وقت معاشرے میں موجود ہے وہ اسلام اور پیغمبر علیہ السلام کی حقیقی نمائندگی نہیں کرتا۔ چنانچہ اس وقت کرنے کا کام یہی ہے کہ اسلام کی حقیقی دعوت اور استدلال کو بیان کیا جائے اور اپنے گریبان میں جھانک کر اپنی غلطیوں کی اصلاح کی جائے۔ اس کے بغیر کی جانے والی ہر کوشش بائیں بازو کو مضبوط کردے گی۔

شاید کوئی مل جائے

اس وسیع وعریض کائنات میں انسان کیا ہے؟ عدم سے وجود پانے والی ایک ناقابل تذکرہ ہستی۔ جو کل شروع ہوا تو ایک قطرہ آب تھا۔جس کا آج نجاستوں اور غلاظتوں سے بھرا ایک حیوانی وجود ہے۔جس کا کل قبر کا گڑھا اور مٹی کا ڈھیر ہوگا۔انسان زندہ رہے تو اس کائنات کو کیا فرق پڑتا ہے؟ وہ مر جائے تو کیا فرق پڑ جائے گا؟ سچ کہوں تو کچھ نہیں۔

مگر اس بے وقعت وجود کو قیمتی بنا دینے والی صرف ایک چیز ہے۔وہ یہ کہ نجاستوں کا یہ ڈھیر؛ خون، بدبو اور حیوانیت کا یہ مجموعہ؛ اپنی تمام تر کثافت کے اندر ایک لطافت رکھتا ہے۔ یہ لطافت اس احساس کی لطافت ہے جو جب کبھی ظاہر ہوتی ہے، معجزے تخلیق کرتی ہے۔

انسان اس احساس سے تاج محل کو تخلیق کرتا ہے۔ وہ شاہکار غزلیں، لافانی داستانیں، بے مثال فن پارے اور بے پناہ تاثر کے حامل نغمے بکھیر سکتا ہے۔آہ! مگر اس انسان کا المیہ یہ ہے کہ احساس کی یہ ساری لطافت اپنے جیسے انسانوں کے لیے جنم لیتی ہے۔کوئی انسان کے عشق میں اسیر ہو جاتا ہے اور کوئی انسانوں کی عظمتوں میں گم ہو جاتا ہے۔

یہ حق تو صرف رب عظیم کا تھا کہ احساس کا ہر جوہر اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز رہتا۔اعتراف کا ہر جذبہ اس کی بڑائی کے سامنے سرنگوں رہتا۔محبت کا ہر رنگ اس کی عنایات کا احسان مند رہتا۔

لوگ غیب میں پوشیدہ خدا کی ان مہربانیوں کو تلاش کرتے جو ہر جگہ عیاں ہیں۔لوگ آنکھوں کی گرفت اور حد ادراک سے بلند خدا کو اپنی نعمتوں کے عکس میں ڈھونڈتے اور نہاں خانہ دل میں اس کے حضور شکر گزاری کی نذر چڑھاتے۔

مگر افسوس! انسان اس بلندی پر تو کیا چڑھتا، پستی کا یہ مکیں گرنے پر آتا ہے تو گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ کیسا لطیف احساس تھا جو انسان کو دیا گیا تھا۔مگر انسان اپنے اس جمال کو زوال کے

گڑھے میں پھینک دیتے ہیں۔ اپنے ذوق کی اس لطافت کو اخلاق کی غلاظت سے بھر دیتے ہیں۔ وہ اپنے جذبات کو نفرت انانیت اور تعصب سے، اپنی زبان کو جھوٹ، بہتان اور لغویات سے، اپنے عمل کو ظلم، حق تلفی اور زیادتی سے آلودہ کر دیتے ہیں۔

اس سے بڑا ستم یہ ہے کہ چار سو پھیلی اس گمراہی میں جن لوگوں کو یہ ذمہ داری دی گئی تھی کہ وہ صحیح بات کی طرف رہنمائی کریں، وہی سب سے بڑھ کر اندھیرے پھیلا رہے ہیں۔ جن لوگوں کو چراغ دیے گئے تھے کہ روشنی کریں، وہ ان چراغوں سے شہر کو آگ لگا رہے ہیں۔

ایسے میں۔۔۔ مذہبی انتہا پسندی اور ظاہر پرستی کے اس دور میں لطیف احساس کے مالک ایسے اعلیٰ انسانوں کو کہاں ڈھونڈا جائے؟ فرقہ واریت اور قوم پرستی کے مارے ہوؤں میں سچے خدا پرستوں کو کہاں تلاش کیا جائے؟ مفاد پرستوں اور اکابر پرستوں کے بیچ میں وہ عباد الرحمٰن کہاں سے پاؤں جو تعصّبات، خواہشات اور مفادات سے بلند ہو چکے ہوں؟

مگر پھر بھی ڈھونڈتا ہوں۔ اس لیے کہ یہی لوگ حاصل تخلیق ہیں۔ شاید کہیں دور کوئی بنت حوا، کوئی ابن آدم اپنی کثافتوں سے نکل کر لطافتوں کی اس دنیا میں آنے کو تیار ہو۔ ہوسکتا ہے کہ کسی گوشے میں کوئی متلاشی حق موجود ہو۔ کوئی ہو جو شیطانوں کی غلیظ دنیا سے نکل کر فرشتوں کی پاکیزہ دنیا میں آنا چاہتا ہو۔ جو انسانی عظمت کو سجدہ کرنے کے بجائے خدائی عظمت کے سامنے پیشانی ٹیکنے کو تیار ہو جائے۔ کوئی ہو جو حمد، تسبیح، تمجید کے موتی اور عجز، محبت، شکر گزاری کے آنسو خدائے ذوالجلال کو پیش کرنا چاہتا ہو۔ کوئی ہو جو خدا کی محبت اور کردار کی عظمت کے نبوی نمونے کو اپنانے کے لیے تیار ہو۔ کوئی ہو جو صبر، خدمت اور محبت کا نمونہ بننے کے لیے تیار ہو۔

بس اسی تلاش میں زندگی گزر گئی۔۔۔ اور اسی تلاش میں زندگی گزر رہی ہے۔۔۔ شاید کوئی مل جائے۔۔۔ اسی لیے لکھتا ہوں۔۔۔ اسی لیے بولتا ہوں۔۔۔ شاید کوئی مل جائے۔

دوانتہائیں

میں عام طور پر ٹی وی نہیں دیکھتا۔ لیکن آج ٹی وی پر علامہ اقبال کی شکوہ اور جواب شکوہ دوگلوکاروں کو خوبصورت انداز سے پڑھتے ہوئے سنی تو دیکھنے بیٹھ گیا۔ بیچ میں اشتہارات کا وقفہ آ گیا۔ چونکہ پورا کلام سننا چاہ رہا تھا تو وہ بھی دیکھنے پڑے۔ موبائل کمپنی کے طویل اشتہار میں یہ دکھایا گیا تھا کہ کالج کے لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھنے کے علاوہ مل کر کھیلنے اور مختلف تفریحات کرنے میں مشغول تھے۔

اس اشتہار میں ایک منظر یہ بھی دکھایا گیا کہ باہمی طور پر مل کر کرکٹ کھیلتے ہوئے ایک لڑکی شاٹ لگاتی ہے اور گیند لڑکے کے انتہائی نازک مقام کو نشانہ بناتی ہے۔ وہ سب لوگ جنھوں نے کرکٹ کھیلی ہے، جانتے ہیں کہ اس کے بعد صورتحال کتنی نازک ہو جاتی ہے۔ یہ منظر اگر لڑکوں کی کرکٹ میں دکھایا جاتا تو شاید مزاح کا کوئی عنصر اس میں ڈھونڈ لیا جاتا، لیکن لڑکی کے شاٹ پر لڑکے کے ساتھ یہ ہوتے ہوئے دکھانا بے ہودگی کے سوا کچھ نہیں۔

بہرحال ایک طرف یہ کلچر ہے جو میڈیا کے زیر اثر ہماری اشرافیہ سے گزر کر اب تعلیم یافتہ طبقات میں تیزی سے عام ہو رہا ہے اور دوسری طرف میں اقبال کی شکوہ جواب شکوہ سنتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ اقبال کی بڑی خوش نصیبی ہے کہ وہ پچھلی صدی میں رخصت ہو گئے۔ ورنہ جو کچھ انھوں نے اپنے اشعار اور خطبات میں ارشاد فرمایا ہے، اس کے بعد وہ یا تو کسی خودکش حملے میں شہید ہو کر بارگاہ الوہیت میں براہ راست شکوہ کرتے ہوئے پہنچ جاتے یا پھر کفر و ضلالت کے فتووں کے ہار گلے میں لٹکا کر ملک سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو جاتے۔

اسی جواب شکوہ کو دیکھ لیجیے۔ اس میں وہ پوری نظم میں اللہ تعالیٰ طرف سے بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ یہ مسلمانوں کی علمی روایت اور ادب عالیہ میں کوئی انہونی بات

نہیں، یہی ایک بات ان کو کفر اور گستاخی کا مرتکب قرار دینے کے لیے بہت تھی۔ یہی انتہا پسندانہ سوچ ہے جو مذہب کے نام پر اس معاشرے میں تیزی سے فروغ پا رہی ہے جس میں ایمان واخلاق کا مجسم نمونہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی تو کہیں نظر نہیں آتی، لیکن فرقہ واریت، عدم برداشت، نفرت، کفر وضلالت کے فتوے، اختلاف رائے کرنے والوں کے خلاف مہم بازی اور دہشت گردوں کی خاموش اور اعلانیہ حمایت کے سارے عناصر جمع ہیں۔

بے لگام آزاد خیالی اور انتہا پسندی کی یہی وہ دو انتہائیں جن کے درمیان یہ قوم ایک عرصے سے پستی جا رہی ہے۔ اور اس وقت تک پستی رہے گی جب تک وہ دین کی اصل تعلیم کو اختیار نہیں کرے گی۔ دین کی یہ اصل تعلیم حضور کی وہ زندگی ہے جسے ہماری ماں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایسے بیان کیا کہ کان خلقه القران، (صحیح مسلم، رقم 1773) یعنی قران مجید ہی آپ کا اخلاق تھا۔ ہم نے ایمان و اخلاق پر مبنی اس تعلیم کو اپنی کتاب ''قرآن کا مطلوب انسان'' میں جمع کر دیا ہے۔

ایمان واخلاق پر مبنی دین کی تعلیم صرف انتہا پسندانہ رویوں ہی سے ہماری نجات کی ہی نہیں بلکہ دنیا وآخرت میں ہماری فلاح کی ضامن بھی ہیں۔ اس تعلیم کا خلاصہ کیا ہے۔ وہ ایمان جو خدا کی ہستی اور اس کی ملاقات کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لے۔ وہ اخلاق جو خالق کی بندگی اور مخلوق کی خدمت، عدل، احسان، ایثار سے عبارت ہو اور فواحش، مسلمہ برائیوں اور زیادتی کے کاموں سے انسان کو روکنے والا ہو۔ وہ شریعت جو تمام بدعات اور انسانی اضافوں سے پاک ہو۔

اس ایمان، اخلاق اور شریعت کے بارے میں قرآن مجید آخری درجے میں واضح ہے کہ یہ دنیا میں مجموعی قومی فلاح اور آخرت میں فرد کی کامیابی کو یقینی بنانے والی ہے۔ اسی تعلیم نے صحابہ کرام کے قدموں میں دنیا کا اقتدار لا ڈالا اور یہی آج ہمارے غلبہ کا واحد راستہ ہے۔

بنیادی اقدار

کچھ عرصے قبل میں آسٹریلیا گیا۔ وہاں کے تقریبا تمام ہی اہم شہروں جیسے سڈنی، ملبورن، برسبین، کینبرا، ایڈیلیڈ اور پرتھ جانا ہوا۔ وہاں مختلف نوعیت کے تجربات پیش آئے۔ مثلاً ایڈیلیڈ میں میرے میزبان عامر نے مجھے ایک ہوٹل میں ٹھہرایا۔ جب وہاں سے رخصت ہونے لگے تو میزبان نے ریسیپشن پر ادائیگی کی اور ہم ہوٹل سے باہر آگئے۔ حالانکہ میرا خیال تھا کہ ہوٹل کے ملازمین پہلے کمرے میں جا کر یہ چیک کریں گے کہ ہم نے وہاں رکھی ہوئی چیزوں میں سے کیا استعمال کیا اوراس کے پیسے بل میں شامل کریں گے۔ مگر ریسپشن پر موجود لڑکی نے بس اتنا پوچھا کہ کیا کچھ چیزیں استعمال کی تھیں۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو اس نے چیک کیے بغیر بل بنا دیا۔

سڈنی میں ایک شاپنگ سنٹر میں کچھ گروسری کی نوعیت کی چیزیں خریدیں۔ میرے ساتھ ایک دوست عاطف تھے۔ ادائیگی کے وقت انھوں نے خود ہی اشیا اسکین کیں۔ خود ہی بل بنایا اور خود ہی ادائیگی کر لی۔ کسی نے ہم کو چیک نہیں کیا۔

ان واقعات کا مطلب یقیناً یہ نہیں ہے کہ وہاں سب فرشتے بستے ہیں اور چوری چکاری یا بد دیانتی نہیں ہوتی۔ مگر یہ استثنائی عمل ہوتا ہے یعنی ایسے کام کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کی اسکول میں تعلیم کے دوران میں تربیت اس طرح کر دی جاتی ہے کہ وہ کچھ بنیادی اجتماعی اقدار کو بہت اہمیت دینے لگتے ہیں۔ انھی میں سے ایک سچائی اور دیانت داری ہے۔ اس کے نتیجے میں لوگ عام طور پر سچ بولتے ہیں۔ دیانت داری سے کام لیتے ہیں۔

اقدار کو اپنا مسئلہ بنانے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کا معاشرہ طرح طرح کی ان پابندیوں اور مشکلات میں گھرا ہوا نہیں ہے جو ہم نے اپنے ہاں لگا رکھی ہیں۔ مثال کے طور پر میری رہائش عرصے تک ایک مشہور سپر مارکیٹ کے قریب رہی جہاں شہر بھر سے لوگ آتے تھے۔ اس مارکیٹ

کے اندر داخل ہوتے وقت پرس اور بیگ باہر رکھوائے جاتے تھے کہ لوگ ان میں چھپا کر چیزیں نہ ڈال لیں۔ پھر ہر جگہ لوگوں کی نگرانی کے لیے ملازمین کھڑے تھے کہ چھوٹی موٹی اشیا جیب میں نہ ڈال لیں۔ قیمت کی ادائیگی کے بعد سامان لے کر باہر نکلنے والے ہر شخص کو چیک کرنے کے لیے مزید ملازمین تھے جو ادائیگی کی رسید سے سامان ملا کر یہ دیکھتے تھے کہ واقعی یہ شخص ادائیگی کر کے نکل رہا ہے یا ایسے ہی نکل آیا ہے۔

ایسی یا اس سے ملتی جلتی پالیسیاں ہر جگہ ہمیں اپنے ہاں اس لیے نظر آتی ہیں کہ ہم نے مسلمہ بنیادی اقدار کو اپنے ہر فرد کا مسئلہ نہیں بنایا۔ اقدار کو افراد کی زندگی اور مسئلہ بنانے کا یہ کام اصلاً نظام تعلیم سے ہوتا ہے۔ مگر ہم اپنے نظام تعلیم کی کیا بات کریں کہ یہاں ایک ملک میں چھ، سات قسم کے نظام تعلیم چل رہے ہیں۔ ہر کسی کی اپنی ترجیحات ہیں۔ مگر شاید اقدار کسی کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ کام اساتذہ کرتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں کامیاب اور اچھا استاد وہ ہے جو اسٹوڈنٹ کو امتحان میں زیادہ نمبر لانے میں مدد کرے۔ جس کے سبجیکٹ کا بورڈ میں زیادہ اچھا نتیجہ آئے۔

یہ کام والدین اور خاندان کے بزرگ کرتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں والدین اور بڑوں نے اپنا کام صرف یہ سمجھ رکھا ہے کہ بچوں کو اسکول اور ٹیوشن بھیج دیں اور ان کی مادی ضروریات اور خواہشات کی تکمیل کے لیے دن رات ایک کر دیں۔ یہ کام مذہبی لیڈر کرتے ہیں۔ مگر ان کی اصل دلچسپی اپنے فرقے کے فروغ اور چند ظاہری اعمال کو افراد کی نگاہ میں اہم ترین بنا کر دکھانا ہے۔

یہی ہمارے ہاں کی اصل حقیقتیں ہیں۔ اس کے بعد یہ کیسے ممکن ہے کہ معاشرے میں عدل، دیانت اور سچائی پھیلے۔ ایسے معاشروں میں مادیت اور فرقہ واریت پھیلا کرتی ہے۔ غور کیجیے ایک عرصے سے یہی وہ فصل ہے جسے ہم کاٹ رہے ہیں۔ کیونکہ یہی وہ فصل ہے جس کے بیج ہم بوتے چلے آ رہے ہیں۔

ڈاکٹر شہزاد سلیم/محمود مرزا

دوسروں کے دکھ بانٹیں

ہم اکثر و بیشتر اپنی ذات میں ہی مشغول رہتے ہیں۔ ہماری خواہشات، ہمارے خوف، ہمارے آئیڈیلز، ہماری پریشانیاں، ہمارا آرام وسکون، ہمارے اہل وعیال اور ایک نہ ختم ہونے والی طویل فہرست۔ اگر چہ اپنی ذات کے بارے میں سوچنے میں کوئی قباحت نہیں ہے لیکن اصل تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ہم اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر دیکھنے کی زحمت ہی نہ کریں۔ یعنی اگر ہم اس قابل بھی نہیں ہیں کہ کسی کے درد کو دیکھ سکیں تو یہ سراسر خودغرضی ہے اور ایک قابلِ تشویش بات بھی۔

ایسی بہت سی صورتیں ہوتی ہیں جو ہم سے فوری توجہ کا تقاضہ کرتی ہیں جیسے ہمارے والدین کا رنجیدہ ہونا، کسی ملازم کو کوئی پریشانی لاحق ہونا، کسی دوست کا سخت تکلیف میں ہونا، کسی پڑوسی کا دکھی ہونا، عزیز و اقارب میں سے کسی کا غمزدہ ہونا، اپنے پالتو جانور کا تکلیف میں ہونا یا پھر کسی پودے کو پانی کی ضرورت ہونا۔ ان میں سے یا ان جیسی کوئی بھی صورت ہو ہمیں چاہیے کہ ہم ہمیشہ باخبر رہیں اور مدد کے لیے ہر گھڑی تیار رہیں۔ ہمیں اس انداز میں اپنی تربیت کرنی چاہیے کہ ہمارے دماغ کا اینٹینا گردوپیش میں موجود رنج والم کے ہر سگنل کو باآسانی کیچ کرلے اور ہماری آنکھیں اور کان ہمارے ماحول میں پائے جانے والے ہر دکھ اور ہر پریشانی کا فوراً احاطہ کرلیں۔

اگر اس ضمن میں ہم نے متنبہ رہنا سیکھ لیا ہے تو پھر اس سے اگلا مرحلہ لازمی طور پر عملی اقدام کا ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں ہمیں چاہیے کہ اس طرح کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ہم ہر ممکن کوشش کریں اور لوگوں کی مدد کریں چاہے وہ مدد معاشی ہو، جسمانی ہو یا پھر جذباتی۔ البتہ اگر

ان میں سی کچھ بھی ممکن نہ ہو تو تب بھی کچھ ایسے مثبت اقدامات ہیں جو ہم لے سکتے ہیں۔ وہ اقدامات درج ذیل ہیں۔

- تکلیف زدہ شخص کا مسئلہ سنیے۔ اس سے کسی حد تک اس کی تکلیف کم ہو گی۔
- اس مسئلہ کے بارے میں دوسروں کو آگاہ کیجیے۔ ہو سکتا ہے وہ اس سلسلے میں کچھ مددگار ثابت ہوں۔
- اگر وہ اس سلسلے میں کچھ نہ کر پائیں تو پھر ان سے بھی گزارش کیجیے کہ وہ بھی اپنے اپنے دائرے میں اس بات کو دوسرے لوگوں کے گوش گزار کر دیں۔
- اپنے پروردگار سے دل کی گہرائیوں سے گڑگڑا کر التجا کیجیے۔ کہتے ہیں کہ دعاؤں میں وہ اثر ہوتا ہے کہ وہ پہاڑ کو بھی ہلا دیتی ہیں۔

سارہ عباس

مسجد اور عورتیں

پچھلے سال مجھے عمرہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔اس روحانی سفر نے میرے لئے ایک نئی دنیا کے دروازے کھول دیئے۔وہ دنیا مساجد کی دنیا تھی، باجماعت نماز ادا کرنے کی دنیا تھی۔چونکہ ہمارے ملک میں ہم عورتوں کو اس نعمتِ عظیم سے محروم رکھا جاتا ہے لہٰذا مجھے پہلی دفعہ نماز ادا کرنے کا اصل سرور آیا اور اس کی صحیح معنوں میں اسپرٹ زندہ ہوگئی۔مسجد نبوی اور مسجد الحرام میں کم وبیش ایک جیسا ماحول تھا یعنی عورتوں اور مردوں دونوں کی لیے باجماعت نماز ادا کرنے کے یکساں مواقع موجود تھے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ دین اسلام کی کرنیں وہیں سے پھوٹی تھیں اور پھر پوری دنیا میں پھیل گئیں۔

وہاں ایک سحر انگیز ماحول تھا۔سب کا مؤذن کی پکار پر اپنا سب کچھ اسی طرح چھوڑ کر مسجد کی طرف قدم بڑھانا اور پھر اپنے خالقِ حقیقی کے آگے سب کے ساتھ مل کر امام صاحب کے پیچھے سر بسجود ہونے میں جو مزہ ہے وہ کبھی اکیلے گھر میں آ ہی نہیں سکتا۔گویا کہ اپنے سارے اختلافات و تعصّبات ایک طرف رکھ دیئے گئے ہوں۔سب ایک صف میں یک دل، یک زبان ہو کر اپنے ربِ کریم کے ساتھ مکالمے میں مصرف ہوتے تھے۔امام صاحب پہلے قرآنِ مجید کی تلاوت کرتے اور پھر ''اللہ اکبر'' کہہ کر ہم سب کا اپنے خالقِ ذوالجلال کے آگے سر خم کرنا ایسا تھا جیسے اس کی بات سن کر لبیک کہہ کر اپنا سر، تن، من، اس کے آگے نچھاور کر دیا ہو۔گویا کہ صرف زبان ہی نہیں جسم کا ایک ایک انگ اس کی تسبیح کر رہا ہو۔اور آخر میں ایک دوسرے پر سلامتی ایک پیغام تھا کہ اب ہم سب کے لیے باعثِ سلامتی ہیں باعث آزار نہیں۔میں اس روحانی کیفیت سے اتنا مسحور ہوئی کہ واپس پاکستان آ کر بہت عرصہ میرا نمازوں میں دل ہی نہیں لگا۔ایسے جیسے اس

رحمٰن ورحیم کا حق ہی ادا نہ ہوا ہو۔میں بے بسی سے مساجد کو دیکھتی ہوں کہ یہاں بھی با جماعت نماز ہوگی اور اسی روحانیت کو حاصل کرنے کا موقع مل سکے گا لیکن صرف مردوں کو۔آج تک میرے لئے وہ مرد جو مؤذن کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے مساجد کا رخ کرتے ہیں باعثِ حسرت ہیں۔اور بہت ہی بد قسمت ہیں وہ مرد جو اتنا سنہری موقع ہوتے ہوئے بھی اس سے مستفید نہیں ہوتے۔اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے بے پناہ اجر،قرب، دلی طمانیت اور روحانیت کے بیش قیمت لمحات سے محروم کر دیتے ہیں۔اور یہ موقع اللہ تعالیٰ ایک بار نہیں بلکہ دن میں پانچ بار عطا کرتے ہیں۔پانچ بار روزانہ دل پر دستک ملتی ہے۔مسجد الحرام میں خانہ کعبہ کے گرد طواف جیسی عظیم عبادت تک روک دی جاتی ہے اور با جماعت نماز ادا کی جاتی ہے لیکن افسوس کہ یہاں ہمارے دنیا کے جھمیلے بہت اہم ہیں۔ان سب سے زیادہ اہم نماز ہے،مگر ہمیں یہ بات یاد نہیں رہتی۔

اعتذار

ماہنامہ انذار کے فروری کے شمارے میں ایک مضمون ''نیت'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔مضمون کے ساتھ بطور مصنفہ غلطی سے فرح رضوان صاحبہ کا نام شائع ہو گیا تھا۔قارئین نوٹ کر لیں کہ اس مضمون کی اصل مصنفہ شمائلہ عثمان صاحبہ ہیں۔ ادارہ اس غلطی پر معذرت خواہ ہے۔

فرح رضوان

بات گو ذرا سی ہے، بات عمر بھر کی ہے

"پڑھ لے یار،تھوڑا دل لگا کر بھی پڑھ لے،اور کتنے کوئی دن لگانے ہیں،تو نے سبق پکّا کرنے میں! ہیں......؟"

فیملی روم میں رکھے ڈیسک ٹاپ کے ذریعے قاری صاحب اور نوعمر، گورا بابو ٹائپ بیٹے کے ہر روز سکائپ پر اسی قسم کے مکالمے شروع۔ ساتھ ہی لگے کچن میں دن بھر کی جاب سے تھکی ٹوٹی ماں، کچھ ہی دیر قبل واپس آ کر تیزی سے کام نمٹانے میں مصروف، بار بار آ کر کبھی بیٹے کو پیار سے قرآن کا سبق پڑھنے پر ابھارتی ہے،تو کبھی زِچ ہو کر آنکھیں دکھاتی ہے،اور ہر روز کچھ منٹ کی کلاس یونہی رینگتی ایک ماہ پورا کرتی ہے،اور والدین قاری صاحب کے اکاؤنٹ میں فیس جمع کروا دیتے ہیں۔ یہ ہے کسی بھی غیر مسلم ملک میں رہنے والے ایک عام پاکستانی فیملی کے بچوں کا قران سے رابطہ۔

جبکہ پاکستان کا معمول یہ ہے کہ بچہ ابھی ابھی سکول میں دن بھر کی انرجی لگا کر، بھوکا پیاسا تھکا ہوا گھر لوٹا ہے،قاری صاحب کے آنے کا وقت سر پر ہے، روز کی جھک جھک شروع؛ ''مما آج چھٹی کرا دیں پلیز، میرا ٹیسٹ تھا میں نے قاری صاحب کا سبق یاد نہیں کیا۔'' اس پر ماں کی زبردست جھاڑ؛ ''ٹی وی دیکھنے،فون پر کھیلنے کے لیے وقت تھا،اتنے سے سبق کے لیے وقت نہیں تھا!'' بچے کے گلے میں پھنسا آنسوؤں کا گولہ،غم کی شدت سے رندھی آواز؛ مما پلیز نا! پلیز ......'' ڈنگ ڈونگ......ڈور بیل (بظاہر بجتی ہے) لیکن بچے کے دل پر گویا طبل جنگ بج گیا ہو۔

قاری صاحب وہی سلام کرتے گھر کے اندر داخل ہوتے ہیں جس کا مطلب ہوتا ہے کہ تم کو مجھ سے کوئی خطرہ نہیں تم امن میں ہو،لیکن! بیٹھتے ہی بچے کو حقیر لہجے میں ڈانٹ ڈپٹ، جھڑکی

،دھمکی کا ماحول گرم ،یہی کچھ حال ،اکثر اپنے اپنے گھروں میں پڑھانے والی کم عمر یا عمر رسیدہ خواتین کا بھی ہوتا ہے کہ وہ ان ''شریر'' بچوں پر غصے میں بھنّا اٹھتی ہیں،'' بچے بھی ایسے ڈھیٹ'' کہ سمجھ کر ہی نہیں دیتے، حتی کہ پڑھانے والے کا اخلاق ہتّھے سے اکھڑ نہ جائے، چیخ چیخ کر گلہ دکھ نہ جائے ،اعصاب شل نہ ہو جائیں۔

آپ کو پتہ ہے نا! کہ کسی بھی سپورٹس میں کامیابی کی دو بہت بڑی وجوہات میں سے ،پہلی اپنے ہی کھیلے گئے کھیل کی وڈیو کو بار بار دیکھ کر اپنی خامیاں تلاش کر کے ان کا سد باب کرنا، دوسرا کسی بھی بہترین کھلاڑی کی کارکردگی کو بار بار دیکھ کر اس سے سبق لینا شامل ہے۔کھیل کی نسبت عمر بھر کی بات یقیناً، سدھار کی کہیں زیادہ مستحق ہے۔تو اب تک جو بھی ماحول آپ نے ریکارڈ کیا، اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا؟ اور باذن اللہ، ہماری ذرا سی محنت،اور تھوڑے تدبر سے کیا کیا بہتری لائی جاسکتی ہے؟

والدین یا اساتذہ میں سب سے بڑی خامی تحمل،حکمت اور اخلاق کا فقدان ؛ سوچیں تو سہی کہ وہ بچہ جو اگر باہر کسی ملک میں پڑھ رہا ہے جس سے دن بھر اس کی ٹیچر،سویٹ ہارٹ اور ہنی سے کم طرز تخاطب پر بات ہی نہیں کرتی ،گڑ اور گلاب جامن میں لپیٹ لپیٹ کر جو چاہتی ہے وہ عقیدہ دماغ میں بھر دیتی ہے کہ بے شک آپ ساری زندگی بچے کو آدم علیہ السلام کی اولاد ہونے کا یقین دلاتے رہیں، وہ ڈارون کے فلسفے کا معتقد بنا رہے گا۔محبت ایسا نغمہ ہے، ذرا بھی جَھول ہوئے میں،تو سُر قائم نہیں رہتا۔

جس دین نے جنگ کی حالت میں بھی ہر طرح سے اخلاق کی پاسداری کا حکم دیا ہے۔چھوٹوں پر شفقت، یا بڑوں کی عزت نہ کرنے پر اتنی بڑی بات کہ وہ ہم میں سے نہیں !اس دین کے پیروکار، بچوں کو قرآن، بصورت ناظرہ ہو یا حفظ یا پھر اسلامیات ہی، آخر کس اخلاقی

سطح پر سکھا رہے ہیں؟

فقط باتیں اندھیروں کی، محض قصے اجالوں کے
چراغ آرزو لے کر نہ تم نکلے نہ ہم نکلے

تلخی، خوف، جبر، غصہ یا تضحیک میں سے کوئی ایک رویہ بھی کارگر نہیں ہے اس جنگ میں۔ ہیں!...... یہ اچانک سے جنگ کا ذکر کیسے آ گیا؟ دراصل جب تک ہم اس بات کو ہر دم، ہر قدم پر یاد نہیں رکھیں گے کہ ازل سے شیطان ہمارا دشمن ہے اور ہر رخ ہر زاویہ سے جنگی محاذ پر کمر بستہ بھی، تو اس وقت تک ہم کبھی بھی کوئی بہتر اور پختہ لائحہ عمل تیار نہیں کر پائیں گے۔ اس سلسلے میں فوری طور پر والدین اور اساتذہ کو بحیثیت ٹیم، کام کرنے کی اشد ترین ضرورت ہے۔

مانا کہ اکثر بچے جھوٹ بھی بولتے ہیں، ڈرامہ بھی کرتے ہیں، لاپرواہی بھی، چیٹنگ بھی، لیکن جان لیں کہ ایک جانب ان سے یہ سب کچھ شیطان کروا رہا ہے، جس سے فی الحال وہ لاعلم ہیں اور دوسری جانب آپ کا شیطان ہے جو، دن بھر کا ہی نہیں بلکہ عمر بھر کا تمام تر غصہ ان پر الٹ دینے کا مکمل جواز پیش کر رہا ہے۔ لیکن! سزا واجب ہو جانے پر بھی بچے کو معاف کر کے ضرور دیکھئے گا۔ اس کی کارکردگی دگنی چوگنی ہو جاتی ہے۔ اکثر اوقات غصے کے تلخ گھونٹ کو صبر سے پی جانا ایک نہیں کئی شیطانوں پر آپ کی فتح ثابت ہوگا۔ اٹک اٹک کر پڑھنے پر دوہرا اجر ہے تو ایسے فرد کو صبر سے سکھانے پر خود ہی سوچیں کیا اجر ہو سکتا ہے! تو خواہ آپ استاد ہیں یا والدین، (ان شا اللہ) کامیابی بھی آپ کی، اجر بھی آپ کا، برکت آپ کے حصے میں، اور عزت آپ کا نصیب ٹھہرے گی۔

سلسلہ روز و شب

ابو یحییٰ

پشاور، لاہور اور اسلام آباد کا سفر

پچھلے برس دسمبر 2016 میں انسٹیٹیوٹ آف مینجمنٹ سائنسز پشاور کے استاد جناب فداء الرحمٰن صاحب اور اسسٹنٹ پروفیسر جناب سکندر تنگی صاحب نے رابطہ کر کے وہاں کے طلباء سے خطاب کرنے کی دعوت دی۔ اپنی مصروفیات کے پیش نظر میں نے فروری کا وقت طے کیا کیونکہ اس وقت مجھے لاہور بھی جانا تھا۔ اسی پس منظر میں فروری 2017 کے مہینے کا نصف اول پشاور، لاہور اور اسلام آباد میں گزرا۔ جس کی روداد قارئین انذار کی نذر ہے۔

سکندر تنگی صاحب غالباً دو برس پہلے بھی مجھے بلانا چاہتے تھے، مگر میں نے اس زمانے میں یہ طے کر رکھا تھا کہ میں پبلک میں نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ کچھ علمی اور فکری کام ابھی ادھورے تھے۔ وہ الحمدللہ بڑی حد تک اب پورے ہو رہے ہیں۔ اس لیے اب اکا دکا میں پبلک دعوتیں قبول کر لیتا ہوں۔ چنانچہ اس دفعہ ان کی دعوت قبول کر لی۔

یا حفیظ یا رقیب

میرا سفر پی آئے کے ذریعے سے تھا۔ ائر پورٹ پر دو تین قابل توجہ واقعات دیکھے۔ ایک یہ کہ بورڈنگ لاؤنج میں داخلے کے وقت سیکیورٹی چیک کی لائن میں ہم لگے ہوئے تھے کہ دو پاکستانی نوجوان آئے۔ اپنا سامان اسکینگ مشین میں رکھا اور بیچ لائن سے اندر آنے لگے۔ اس پر میرے پیچھے لائن میں موجود ایک غیر ملکی نے یہ کہہ کر ان کی توجہ دلائی۔

We are also in line

چنانچہ شرمندہ ہو کر وہ لائن کے آخر میں چلے گئے۔ بدقسمتی سے ہماری فکری قیادت نے قوم کو

صرف احتجاج، نفرت اور حقوق کی فکر دی ہے۔ صبر، ذمہ داری اور اپنے فرائض کا سبق کبھی نہیں پڑھایا۔ اسی لیے ہمارے افراد قطار بنانے جیسی معمولی بنیادی قدر کو بھی اہمیت نہیں دیتے۔

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ ہماری بورڈنگ کا اعلان ہوا تو لوگ جہاز میں جانے کے لیے اٹھ گئے۔ کچھ لوگوں کو ایک سمت جاتے دیکھ کر باقی تمام لوگ بھی انھی کے پیچھے چل پڑے۔ جبکہ میں یہ بات پہلے نوٹ کر چکا تھا کہ بورڈنگ کارڈ میں جس گیٹ کا ذکر ہے، وہ کہیں موجود ہی نہیں ہے۔ اس لیے میں نے قوم کے پیچھے جانے کے بجائے وہاں ڈیوٹی پر معمور ایک شخص سے گیٹ پوچھا تو اس نے بالکل مخالف سمت میں اشارہ کیا۔ یہ زمینی گیٹ تھا جو براہ راست جہاز میں جانے کے بجائے نیچے جاتا تھا اور پھر وہاں سے ایک بس کے ذریعے سے لوگوں کو جہاز میں لے جا رہا تھا۔

بھیڑ چال یا جہاں سب جا رہے ہوں آنکھیں بند کر کے وہاں چلے جانا ایک عام انسانی کمزوری ہے۔ اسی سے اندھی تقلید اور بزرگوں کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلتے چلے جانے کا وہ عمل وجود میں آتا ہے جو ممکنہ طور پر انسان کو جہنم میں پہنچا سکتا ہے۔ اللہ کے ہاں یہ عذر قبول نہیں ہوگا۔ خاص طور پر جہاں سچائی بتانے والے لوگ موجود ہوں۔ مگر یہاں حال یہ ہے کہ لوگ کسی فرقہ میں پیدا ہوتے یا کسی گروپ میں پہنچ جاتے ہیں اور ساری زندگی اسی کو حق سمجھ کر آنکھیں بند کر کے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔

جہاز میں جاتے وقت بس سے یہ دلچسپ منظر دیکھا کہ جہاز پر یا حفیظ یا رقیب لکھا ہوا تھا۔ حال ہی میں پی آئی اے کا ایک جہاز گرنے کے بعد رن وے پر بکرے کی قربانی کے مناظر چونکہ ذہن میں ابھی تازہ تھے، اس لیے یا حفیظ یا رقیب کو دیکھ کر زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ دین کی اصل تعلیم جو ایمان و اخلاق پر مشتمل ہے، جب لوگ اس سے بے نیاز ہو جاتے ہیں تو پھر ایسی ہی چیزیں اس بڑی سطح پر نمایاں ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

اس میں کیا شک ہے کہ ہمارا رب ہم پر نگران (رقیب) بھی ہے اور وہی ہماری حفاظت بھی کرتا ہے۔ مگر یہ اس نے کہاں کہا ہے کہ یا حفیظ یا رقیب پڑھ لو اور لکھ لو اور باقی تمام معاملات میں کوتاہیاں کرتے رہو، تب بھی میں تمھاری حفاظت کروں گا۔ مگر وظائف اور فضائل میں پروان چڑھی قوم کو یہ کون سمجھائے اور کیسے سمجھائے؟

آخری زمانے والے

جہاز میں میری سیٹ سب سے پیچھے اور وسط میں تھی۔ مگر جہاز چلنے سے قبل جہاز کے عملے نے مجھے سب سے آگے ونڈ وسیٹ پر جانے کی خود درخواست کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے برابر میں ایک خاتون مسافر آ گئی تھیں۔ میں نے بصد خوشی یہ پیشکش قبول کی کیونکہ بورڈنگ کے وقت میں نے ونڈ وسیٹ مانگی تھی جو نہیں ملی تھی۔ ونڈ وسیٹ کے علاوہ یہاں یہ بھی فائدہ تھا کہ پہلی نشست ہونے کی بنا پر ٹانگ پھیلانے کی بھی کافی کشادہ جگہ تھی اور یوں دو گھنٹے کی یہ فلائٹ آسانی سے گزر گئی۔

مجھے خیال آیا کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے آخر میں پیدا ہوئے ہیں۔ قرآن مجید کی تصریح سے یہ معلوم ہے کہ اس زمانے کے بہت کم لوگ آخرت میں اعلیٰ مقام حاصل کرسکیں گے۔ میرے دل سے دعا نکلی کہ کاش پروردگار قیامت کے دن بلا استحقاق ہم پیچھے والوں کو آگے پہنچا دیں۔ پھر خیال آیا کہ یہ سب اتنا بلا استحقاق بھی نہیں ہوگا۔ انسان کو خدا کو اپنا سب سے بڑا مسئلہ بنانا ہوگا۔ یہ اگر ہے تو رب کریم انسان کے عمل کی کمی کی تلافی کر دے گا۔ اس کے بغیر بڑے سے بڑا عمل بھی کم ہی ثابت ہوگا۔

پشاور: قدیم شہر کی قدیم سہولیات

میری فلائٹ صبح ساڑھے سات کی تھی۔ دو گھنٹے کے بعد ہم پشاور ائیر پورٹ پہنچے۔ مگر یہاں کا

خستہ حال ائیر پورٹ دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ پشاور ایک بڑا شہر ہے۔ 1998 کی مردم شماری کے وقت اس کی آبادی تیس لاکھ تھی۔ بیس برسوں میں دگنی تو ہوچکی ہوگی۔ مگر یہاں نہ زیادہ فلائٹس آتی ہیں اور نہ ائیر پورٹ ڈھنگ کا ہے۔ مجھے واپسی میں یہاں سے لاہور جانا تھا۔ مگر یہ جان کر شاک لگا کہ یہاں سے لاہور کی کوئی فلائٹ نہیں جاتی۔ ائیر پورٹ سے باہر نکلا تو شہر سے آنے والی سڑک پر زبردست ٹریفک جام تھا۔ میں نے سوچا کہ کتنے لوگوں کی فلائٹ صرف اس ٹریفک جام کی وجہ سے نکل جاتی ہوں گی یا کم از کم لوگوں کو ذہنی کوفت اور ٹینشن کا سامنا تو ضرور کرنا پڑتا ہوگا۔

پشاور کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ جنوبی ایشیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک اور پاکستان کا سب سے قدیم شہر ہے۔ شائد ہمارے حکمران سہولیات کے لحاظ سے بھی اسے قدیم ہی رکھنے پر مصر ہیں۔ یہ تاریخی شہر ایک بہت بڑی ٹورسٹ اٹریکشن بن سکتا تھا۔ مگر پچھلے چالیس برس سے جاری افغان جنگ میں ہماری مداخلت نے جہاں پورے ملک کو شدید نقصان پہنچایا ہے، اس شہر کو بھی بہت مشکل میں ڈالا ہے۔ کاش ہماری قوم یہ جان سکے کہ امن کی طاقت اور فوائد کتنے زیادہ ہوتے ہیں۔ مگر امن کا فائدہ عام لوگوں کو ہوتا ہے۔ جبکہ جنگ ہمیشہ لیڈروں اور طاقتور طبقات کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ اس لیے عام طور پر لیڈر اور طاقتور طبقات امن کو پسند نہیں کرتے۔

آئی ایم سائنسز اور سوشل سائنسز

ائیر پورٹ سے سیدھا میں انسٹیٹیوٹ آف مینجمنٹ سائنسز پہنچا جسے مختصراً آئی ایم سائنسز کہا جاتا ہے۔ یہاں میرے میزبانوں فداالرحمٰن صاحب، سکندر تنگی صاحب کے علاوہ یونیورسٹی کے دیگر اساتذہ نے استقبال کیا۔ فدا بہت عرصے سے میرے قاری ہیں۔ انھوں نے پہلی دفعہ میرا تعارف مشہور صحافی سلیم صافی صاحب کے ایک کالم میں پڑھا تھا۔ سلیم صافی صاحب اس زمانے

میں ایک مقامی اخبار مشرق میں کالم لکھا کرتے تھے اور ملکی سطح پر اتنے مشہور نہیں تھے۔ اس کے بعد فدا نے میرا کونٹکٹ نمبر ڈھونڈ کر مجھ سے رابطہ کیا تھا اور تب ہی سے وہ میرے مستقل قاری ہیں۔

آ ئی ایم سائنسز بنیادی طور پر مینجمنٹ سائنسز کی یونیورسٹی ہے اور اسے خیبر پختونخواہ میں وہی حیثیت حاصل ہے جو کراچی میں آئی بی اے یا لاہور میں لمز (LUMS) کو حاصل ہے۔ تاہم سکندر تنگی صاحب نے یہاں پہلی دفعہ سوشل سائنس کا شعبہ قائم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سوشل سائنس دنیا میں ترقی کی بنیاد ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں انجینیئرنگ، میڈیکل، کمپیوٹر سائنس، کامرس اور پھر مینجمنٹ سائنس کے شعبوں کے اعلیٰ ادارے بہت پہلے قائم ہو گئے اور سوشل سائنس کے شعبے کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ مگر اب کراچی، لاہور کے بعد پشاور میں بھی بہترین یونیورسٹیاں سوشل سائنس کے شعبے قائم کر رہی ہیں جن میں ذہین اور باصلاحیت نوجوان پڑھنے آ رہے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو قوم کو ترقی کی راہ پر ڈالیں گے۔ آئی ایم سائنسز اور سکندر تنگی صاحب اس اعتبار سے قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے یہ اہم قدم اٹھایا۔ اس ادارے میں اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے طلبا و طالبات کی بڑی تعداد آتی ہے۔ جس قوم میں اشرافیہ سوشل سائنسز پڑھنا شروع کر دے اسے ترقی سے کوئی نہیں روک سکتا۔

سر سید اور مولانا مودودی

یہ بات ذرا طویل ہو رہی ہے مگر اس موقع پر ماضی کا ایک واقعہ یاد آ گیا ہے۔ جب سر سید کی علی گڑھ یونیورسٹی کی تحریک اپنے عروج پر تھی تو مولانا مودودی نے اس تحریک پر اس پہلو سے تنقید کی تھی کہ یہ لوگ مغرب کی ترقی کا باعث بننے والے اصل علوم یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی کو پڑھانے کے بجائے سماجی علوم کو پڑھا رہے ہیں۔ میں نے جب یہ تنقید پڑھی تو میں اس زمانے

میں کم عمر تھا۔ بظاہر مولانا مودودی کی تنقید درست لگی۔ مگر اب جب خود علوم کو پڑھا ہے اور سماج کو سمجھا ہے تو اندازہ ہوا کہ سرسید کی اپروچ بالکل درست تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ قوموں کے لیے سماجی ترقی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ سوشل سائنسز کی تعلیم اس پہلو سے اجتماعی طور پر کہیں زیادہ اہم ہوتی ہے۔ یورپ نے پہلے سماجی علوم میں ترقی کی۔ فزیکل سائنس میں ترقی کا راستہ کھل گیا۔ بدقسمتی سے ہم نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا۔ اشرافیہ نے بھی اپنے بچوں کو سائنس، میڈیکل اور بزنس وغیرہ کی تعلیم دی۔ جس کی بنا پر ہمارے ہاں بہترین ڈاکٹر، انجینئر ، بزنس کے ماہرین سب ملتے ہیں، مگر سماج میں علم و دانش کی روایت مردہ ہو چکی ہے۔ مگر اب یہ رجحان بدل رہا ہے تو اسے دیکھ کر امید ہو چلی ہے کہ شاید ہمارے سماج میں کوئی حرکت اور زندگی پیدا ہو۔

پختون معاشرہ

سکندر تنگی صاحب مجھے لے کر پہلے ڈائریکٹر کے دفتر میں گئے۔ وہاں اساتذہ کے ساتھ ان کی ایک میٹنگ ہو رہی تھی۔ ان لوگوں نے میٹنگ روک کر ہم سے ملاقات کی۔ پھر میں سکندر تنگی صاحب کے کمرے میں چائے وغیرہ کے لیے آ گیا۔ میں نے سکندر صاحب کے بے دھڑک اندر جانے کے علاوہ دیگر مواقع پر بھی یہ بات دیکھی کہ پختون کلچر کی یہ بڑی خوبی ہے کہ معاشرے میں وہ مصنوعی پن نہیں ہے جو دیگر جگہ نظر آتا ہے۔ یہاں کئی جگہ میں نے سیکیورٹی گارڈ وغیرہ کو اطمینان سے مالکوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے دیکھا۔ پختون معاشرہ کئی پہلوؤں سے فطرت پر قائم ہے۔ مگر مجھے یہ معاشرہ اپنی زبان، ثقافت اور قبائلی پس منظر کی وجہ سے بعض پہلوؤں میں کچھ بند سا محسوس ہوا۔ یہ لوگ اگر اہل پنجاب کی طرح اردو سے زیادہ واقفیت پیدا کرتے تو اس علمی ذخیرے سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے تھے جو علم کی روایت کو ان میں تیزی سے منتقل کر سکتا ہے۔ جس

کے بعد ان کی خوبیاں باقی رہتیں اور کمزوریاں تیزی سے ختم ہوجاتیں۔تاہم دہشت گردی کے کمزور ہوجانے اور امن وامان کے بہتر ہوجانے کے بعد ان لوگوں کے لیے ایک عظیم موقع پیدا ہوا ہے۔ آئی ایم سائنسز اور اس کے اساتذہ سے امید ہے کہ وہ اس معاملے میں پختون معاشرے کی رہنمائی کا کام کریں گے۔

آخرت کی زندگی

آئی ایم سائنسز میں میرا موضوع شخصیت کی تعمیر تھی۔ یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں طلبا وطالبات جمع تھے۔ پروگرام کا وقت کافی تھا اس لیے اس کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ میں نے شخصیت کی تعمیر پر گفتگو کرنے سے قبل اسٹوڈنٹس کو اس دنیا کا تعارف کرایا جس کے لیے یہ شخصیت بنائی گئی تھی۔یعنی آخرت کی دنیا۔اس کے لیے میں نے ایک پریزینٹیشن بنائی تھی۔اس میں منظر کشی کے ذریعے سے آخرت کی دنیا کے مختلف مراحل کا تعارف کرایا گیا تھا۔

طلباء وطالبات کے لیے یہ ایک بڑی دلچسپ چیز تھی۔ مجھے کسی مرحلے پر اپنے سامعین کے چہروں پر بوریت کے آثار محسوس نہیں ہوئے۔ پہلے سیشن کے اختتام پر میں نے پوچھا کہ کیا آپ لوگ دوبارہ آئیں گے تو سب نے ہاں کہا اور اس دوسرے سیشن میں بھی آڈیٹوریم پورا بھرا ہوا تھا۔دوسرے سیشن میں میں نے یہ واضح کیا کہ آخرت کی اس دنیا کے لیے ہمیں اپنی موجودہ شخصیت کو کس رخ پر استوار کرنا ہوگا کہ ہم وہاں کی کامیابی حاصل کرسکیں۔ دونوں سیشن میں طلبا نے سوالات کیے۔ان کے سوالات بہت عمدہ تھے۔مگر وقت کی تنگی کی بنا پر تمام سوالات کو لینا ممکن نہ تھا۔اکثر پروگراموں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

پشاور کی اشرافیہ

آئی ایم سائنسز حیات آباد کے علاقے میں واقع ہے جہاں سرکاری ملازمین، تعلیم یافتہ افراد

اور مقامی اشرافیہ کی رہائش ہے۔ علاقہ اور گھر دونوں ہی مکینوں کی خوشحالی کا بیان کرتے ہیں۔ اسٹوڈنٹس کی ایک بڑی تعداد اسی پس منظر سے یہاں پڑھنے کے لیے آئی تھی۔ گرچہ میزبانوں نے مجھے بتایا تھا کہ بہت سے بچے نسبتاً غریب پس منظر کے بھی ہیں اور وظائف کی بنیاد پر بھی یہاں پڑھ رہے ہیں۔ فدا نے یہ بھی تبصرہ کیا کہ قبائلی علاقہ جات کے طلباء وطالبات جو یو ایس ایڈ سمیت مختلف ملکی وغیر ملکی ڈونر ایجنسیز کی مالی معاونت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور زندگی میں اعلیٰ مقام بھی حاصل کرنے کی پوزیشن میں آجاتے ہیں، ان کا رویہ ہے کہ اس کے باوجود امریکہ کو گالی دینا اپنا ''ایمانی فریضہ'' سمجھتے ہیں۔

کراچی کے اپنے پس منظر کی بنا پر مجھے ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ مگر اگلے دن جب میں دیگر تعلیمی اداروں میں گیا تو اندازہ ہوا کہ یہ لوگ کلچر کے اعتبار سے بھی باقی جگہوں سے ایڈوانس تھے۔ ظاہر ہے کہ لڑکے لڑکیوں کا ایک ساتھ پڑھنا اب کوئی ایسی چیز نہیں جو غیر معمولی ہو۔ مگر پشاور یونیورسٹی میں وہ طالبات جو طلبا کے ساتھ موجود تھیں سو فیصد نقاب میں تھیں اور لڑکوں سے بالکل الگ بیٹھی تھیں۔ جبکہ اسلامیہ کالج کے دورے میں بھی یہی دیکھا۔ جبکہ قرطبہ یونیورسٹی میں تو بچے بچیاں الگ الگ ہی پڑھ رہے تھے اور میں نے دونوں جگہ الگ الگ ہی گفتگو کی۔ جبکہ یہاں کوئی ایک آدھ طالبہ ہی تھی جس نے نقاب کر رکھا تھا۔ کچھ کے سر پر دوپٹہ بھی نہیں تھا۔ جبکہ یہاں لڑکے لڑکیاں ساتھ گروپ کی شکل میں بیٹھے ہوئے بھی نظر آئے تھے۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے یہ سوچ عام ہوگئی ہے کہ اشرافیہ کو ان کے ماڈرن ہونے پر ہدف تنقید بنایا جاتا ہے۔ میں بھی ایک زمانے میں اسی فکر سے متاثر تھا۔ لیکن اب میں ہر شخص کو مدعو اور خود کو داعی سمجھتا ہوں۔ سب کو خدا کا بندہ اور اپنا مخاطب سمجھتا ہوں۔ جس کے بعد اب میرے دل میں لوگوں کے لئے بس خیر خواہی ہی بچی ہے۔ چاہے وہ کسی بھی طبقے سے ہوں۔ اس خیر خواہی کا

تقاضہ یہ ہے کہ ان تک دین کی اصل دعوت یعنی ایمان اور اخلاق کو پہنچایا جائے اور اس کے مطالبات ان پر واضح کیے جائیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں جن لوگوں نے اشرافیہ کو دعوت کا ہدف بنایا ہے، ان کا زور بھی بس اسی پر ہے کہ ان کا ظاہر بدل دیا جائے۔ جبکہ اخلاق و معاملات میں زیادہ فرق نہیں آتا۔ نتیجہ اب یہ نکل رہا ہے کہ اشرافیہ میں سے دو لوگ ان کی سمت جاتے ہیں اور سو لوگ دین سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک خطرناک رجحان ہے۔ اس کا حل یہی ہے کہ تبدیلی کا ہدف وہی ہو جو اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے اور جسے میں نے اپنی کتاب ''قرآن کا مطلوب انسان'' میں جمع کر دیا ہے۔ اس کا خلاصہ تین چیزیں ہیں۔ اللہ کی ذات اور اس سے ملاقات انسان کے لیے اہم ترین ہو جائے اور انسان اس کا شکر گزار بن جائے۔ دوسرا یہ کہ انسان مخلوق کا خیر خواہ بن جائے۔ تیسرا یہ کہ انسان زنا اور بدکاری سے باز رہ کر ایک پاکدامن زندگی گزارنے والا بن جائے۔

شاہ خان صاحب کے ہاں احباب سے ملاقات

دوپہر کا کھانا آئی ایم سائنسز میں کھایا اور سکندر تنگی صاحب کی مہربانی سے مکئی کی روٹی اور ساگ جیسی لذیذ چیز بھی نصیب ہوئی۔ اگرچہ دیگر مرغن کھانے بھی موجود تھے۔ کھانے پر دیگر اساتذہ سے بھی گفتگو ہوتی رہی۔ کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کے لیے میں اپنی رہائش گاہ پر آ گیا جو کہ ایچ ای سی کا گیسٹ ہاؤس تھا اور ہوٹل کی طرح تمام سہولیات وہاں موجود تھیں۔

کچھ دیر آرام کے بعد فدا اور سکندر صاحب مجھے لینے کے لیے آ گئے۔ ان کے ساتھ شاہ خان صاحب کے گھر پہنچے۔ گھر کے قریب ہی اسلم میر صاحب بھی مل گئے جو کہ بڑی صاحب علم شخصیت ہیں۔ وہ کسی کو راستہ دکھانے کے لیے گھر کے قریب ہی کھڑے ہوئے تھے۔ شاہ خان صاحب کے گھر پہنچے تو کئی مہمان وہاں پہلے سے موجود تھے۔ باقی مغرب کے وقت آ گئے۔

مغرب کی نماز ہم نے قریبی مسجد میں ادا کی۔

اسلم میر صاحب اور شاہ خان صاحب ہمارے پرانے احباب میں سے ہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ صاحبان علم اور صاحبان ذوق ہیں۔ شاہ خان صاحب انکم ٹیکس کے کمشنر ہیں جبکہ اسلم میر صاحب پبلک سروس کمیشن میں ہوتے ہیں۔ شاہ خان صاحب کے گھر پر احباب کے ساتھ بڑی تفصیلی گفتگو ہوئی۔ وہاں کوئی تقریر نہیں تھی بلکہ گفتگو اور سوال و جواب کا پروگرام تھا۔ شاہ خان صاحب نے پرتکلف عشائیے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ کھانے پر بھی احباب سے گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ متنوع نوعیت کی گفتگو تھی جس میں میری کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کے علاوہ بہت سے علمی اور فکری امور بھی زیر بحث آئے۔ مثلاً ایک دوست نے قرآن مجید میں حج کے بارے میں بیان کردہ بہت سی تفاصیل پر ایک سوال اٹھایا۔ میں نے عرض کیا کہ دیگر عبادات کے برعکس جن کی بیشتر تفصیلات سنت میں ملتی ہے، حج کی شریعت کو تفصیلاً زیر بحث لانے کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ دیگر عبادات کے برعکس حج سال میں صرف ایک دفعہ اور مسلمانوں کی بہت کم تعداد ادا کرتی ہے۔ سنت چونکہ عملی تواتر سے منتقل ہوتی ہے اور حج کی اس محدود شکل کی بنا پر یہ ممکن تھا کہ حج کی شریعت میں کوئی غلط فہمی پیدا ہوجائے، اس لیے قرآن مجید نے خود اس کو تفصیلاً موضوع بنایا۔ اس طرح اس اہم سنت کو قرآن مجید نے خود تحفظ فراہم کیا ہے۔

نہایت اندیشہ و کمال جنوں

اس پروگرام اور یہاں پر ہونے والی گفتگو کے حوالے سے سب سے دلچسپ چیز پشاور سے واپس آنے کے بعد سامنے آئی۔ واپس آنے کے بعد جب میں بیچ میں رہ جانے والے کام نمٹا رہا تھا تو میرے سامنے ایک ای میل آئی جو کہ اسی نشست میں موجود ایک صاحب نے اگلے دن مجھے کی تھی۔ اس میں انھوں نے فرمایا کہ وہ اس نشست میں موجود تھے اور اس خاکسار کی

گفتگو سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ان کے الفاظ یہ تھے۔

I was highly impressed by your talk and moved a lot

تاہم بقول ان کے اگلے دن انھوں نے میرا ناول ''جب زندگی شروع ہوگی'' پڑھنا شروع کیا تو چند صفحے پڑھ کرانھوں نے محسوس کیا کہ میں نے ایک روایتی ملا کی طرح یوم الحشر کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔میں نے ان کو جو جواب بھیجا وہ تو آگے بیان ہورہا ہے،مگر ایک ہی آدمی کے حوالے سے دو بالکل مختلف نوعیت کے ردعمل کی ایک وجہ ہے۔ وہ یہ کہ میں جب عوام میں دعوت کا کام کرتا ہوں، چاہے تحریر سے یا تقریر سے تو عام طور پر میرے موضوعات ایمان اخلاق کے حوالے سے ہوتے ہیں۔ان میں لوگوں کو کوئی بہت زیادہ انٹلکچول اپیل محسوس نہیں ہوتی۔لیکن جب سوال و جواب ہوتے ہیں یا علمی وفکری گفتگو ہوتی ہے تو یہ خاکسار پھر اسی سطح پر گفتگو کرتا ہے۔جن لوگوں نے اس عاجز کے تحریر کردہ کچھ فکری مباحث پڑھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ پھر اللہ پروردگار کی عنایت سے ساری گرہیں کھل جاتی ہیں۔

جو لوگ انٹلکچول نوعیت کے ہوتے ہیں ان کو تذکیری باتوں میں بہت زیادہ اپیل محسوس نہیں ہوتی۔جو تذکیری ذہن رکھتے ہیں وہ انٹلکچول گفتگو کو وقت کا زیاں اور لفاظی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ دونوں کی اپنی جگہ ایک اہمیت اور مقام ہے۔تاہم میرا نقطہ نظر وہی ہے جو اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے۔

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے

یہ ہے نہایت اندیشہ و کمال جنوں

یعنی ایک مسلمان کو اندیشہ وخیال،فکرونظر اور علم وبصیرت کے میدان میں بھی انتہا پر کھڑے ہونا چاہیے اور ذوق لطافت،شوق ومحبت،تذکیر وتربیت اور اخلاق واصلاح کے میدان میں بھی

کمال پر ہونا چاہیے۔ لیکن یہ بات ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ نجات کسی قسم کی انٹلکچول گفتگو کی صلاحیت پر نہیں ہوتی ۔ یہ ایمان واخلاق کے تقاضے پورے کرنے پر ملتی ہے۔ لیکن ایمان واخلاق کے تقاضے پورے کرنے کے لیے انسان کو اپنی پوری قوت اور انٹلکچول صلاحیت استعمال کرنا پڑتی ہے۔ خاص کر ایمان اور عمل صالح کو احسان کے درجے پر اختیار کرنا ہے تو انسان کے اندر گہری بصیرت ہونا ضروری ہے۔ قرآن مجید یہی گہری بصیرت پیدا کرتا ہے۔ یہ گہری بصیرت کیا ہے۔ یہ اَن دیکھے خدا اور اَن دیکھی آخرت کو عقل کی آنکھوں سے دیکھ کر اس کے مطابق اپنی شخصیت کو ڈھالنا ہے۔ یہی مقصد اس خاکسار کی تمام تذکیری تحریروں کے پیچھے ہوتا ہے۔

اپنے نظریات پر دوسروں کو پرکھنا

بہر حال میں نے ان کو مختصراً یہ جواب دے دیا کہ میری جو بات قرآن مجید کے خلاف ہے وہ بیان کر دیجیے۔ میرے سوال کا مطلب یہ تھا کہ مجھ پر تنقید اس بنیاد پر درست نہیں ہوسکتی کہ کوئی شخص کیا سمجھتا ہے۔ صحیح وغلط کا معیار قرآن مجید ہے نہ کہ میں یا کوئی اور۔ میں نے تو وہی کچھ بیان کیا ہے جو قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔ اگر کوئی عالم (میں نے اصل الفاظ یعنی ملا نہیں لکھے کیوں کہ اب یہ الفاظ تحقیر کے پہلو سے استعمال ہوتے ہیں) بھی یہ بیان کرتا ہے تو کیا غلط کرتا ہے؟ علمی طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے تصورات کے بجائے حقائق کی روشنی میں چیزوں کا جائزہ لینا چاہیے۔ مگر ہمارے ہاں بہت سے لوگ اس بنیادی اصول کو بھی نہیں سمجھتے۔

ایسا ہی ایک معاملہ آئی ایم سائنسز میں پہلے سیشن کے بعد وقفے کے دوران میں پیش آیا تھا۔ باقی تمام طلبہ وطالبات نے تو بڑی دلچسپی سے پورا پروگرام سنا۔ لیکن ایک نوجوان پہلے سیشن کے بعد بڑے جذباتی انداز میں میرے پاس آئے اور فرمایا کہ آپ نے قیامت کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کا کوئی ثبوت قرآن سے دینے میں آپ ناکام ہوگئے ہیں۔ مجھے بعد میں

معلوم ہوا کہ وہ پرویز صاحب کے نقطہ نظر سے متاثر ہیں۔ظاہر ہے کہ ان کے نقطہ نظر کے متاثرین کو آخرت والی بات زیادہ اپیل نہیں کرسکتی۔تاہم میں نے اس وقت ایک اصولی بات کہی۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ میں نے پروگرام کے آغاز پر بتادیا تھا کہ میں ہر مقام پر آیات نقل نہیں کروں گا۔ان کے ساتھ کھڑے ہوئے ایک طالب علم نے کہا کہ واقعی سر نے تو یہ بات پروگرام کے شروع میں بتادی تھی۔پھر میں نے ان سے کہا کہ آپ کو چاہیے کہ آپ مجھ سے پوچھیے کہ فلاں بات جو آپ نے کہی ہے وہ قرآن میں کہاں ہے۔اگر میں آیت پیش نہ کرسکوں تب آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے، میں قرآن سے اس کا ثبوت دینے میں ناکام ہوگیا ہوں۔لیکن اس کے بغیر یہ کہنا کہ میں اپنی بات کا کوئی ثبوت قرآن سے دینے میں ناکام ہوگیا ہوں ایک لایعنی بات ہے۔میری اس بات کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

میرا برسہا برس کا تجربہ ہے کہ اس طرح کے اعتراضات اٹھانے والے لوگ بہت سطحی اور جذباتی اندازفکر رکھتے ہیں۔وہ چیزوں کو نہ توجہ سے سنتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں نہ پڑھتے ہیں۔بس کوئی چیز ان کے نقطہ نظر کے خلاف ہو اس کے خلاف کھڑے ہوجاتے ہیں۔وہ سامنے والے کی بات سمجھنے کے لیے سوال نہیں کرتے۔اپنے تاثر کو عین حق سمجھ کر اعتراض جڑ دیتے ہیں۔یا پھر کوئی انتہائی غیر متعلق نکتہ آفرینی کر کے مطمئن ہوجاتے ہیں۔یہ رویہ ایمان کے تقاضوں کے خلاف ہے اور روز قیامت انسان کی گرفت کا سبب بن سکتا ہے۔

پشاور یونیورسٹی میں پروگرام

اگلی صبح فدا تشریف لے آئے۔زاہد وزیر صاحب نے ایک گاڑی اور ڈرائیور مہیا کردیا جن کے ساتھ ہم پہلے پشاور یونیورسٹی پہنچے۔اس کی عمارت تو باہر سے بہت شاندار تھی۔گرچہ اندر سے تعمیری معاملات اتنے اچھے نہ تھے۔یہاں شعبہ تاریخ میں میرا لیکچر تھا۔

یہاں ہمارے اصل میزبان ڈاکٹر الطاف قادر صاحب لیکن انھیں کسی وجہ سے اچانک گاؤں جانا پڑا تھا۔ ان کی جگہ ہمارا استقبال ڈاکٹر سید وقار علی شاہ صاحب نے کیا۔ کچھ ابتدائی گفتگو کے بعد میرا لیکچر ہوا۔ اس کا موضوع تزکیہ نفس تھا۔ پھر طلبہ و طالبات نے سوالات کیے۔ سوالات جاری تھے کہ وقت ختم ہوگیا۔ میرا یہ تجربہ ہے کہ ہماری مذہبی فکر نے سوالات کی حوصلہ شکنی کا رویہ اختیار کیا ہے۔ یا پھر ان کے جوابات لوگوں کو عقلی طور پر مطمئن نہیں کر پاتے۔ چنانچہ ہمارے جیسا کوئی شخص مل جائے جو دین کی بنیادوں کے ساتھ جڑا ہوا بھی ہو اور سوالات کا معقول جواب بھی دے رہا ہو تو اس سے کیے جانے والے سوالات ختم نہیں ہوتے۔

پروگرام کے آغاز کے وقت تک ڈاکٹر سید وقار علی شاہ صاحب کو پوری طرح علم نہیں تھا کہ میں کون ہوں۔ پروگرام کے دوران میں ان کے علم میں یہ بات آئی کہ یہ خاکسار کون ہے۔ جس پر وہ بہت زیادہ خوش ہوئے۔ پروگرام کے دوران میں شعبے کے ڈین ڈاکٹر سید منہاج الحسن صاحب بھی تشریف لے آئے۔ پروگرام کے بعد ان دونوں سے ڈین صاحب کے کمرے میں گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ای میل پر مجھ سے رابطے میں بھی رہے ہیں۔ میرے پاس ظاہر ہے بے گنتی لوگ رابطے میں رہتے ہیں۔ اس لیے شرمندہ ہونے کے سوا میرے پاس کوئی راستہ نہ تھا کہ میں ان کو نہیں پہچان سکا۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی اہلیہ گرلز کالج میں پرنسپل ہیں۔ انھوں نے پروگرام کی دعوت دی، مگر میرے پاس وقت کی تنگی تھی، اس لیے معذرت کرنا پڑی۔

قرطبہ یونیورسٹی

یہاں سے ہم سیدھے قرطبہ یونیورسٹی گئے۔ وہاں طلبا اور طالبات کی الگ الگ تعلیم کا بندوبست تھا۔ میں ذاتی طور پر اس کو پسند کرتا ہوں۔ اس لیے کہ اس عمر کے طلباء وطالبات کو ساتھ پڑھا کر ہم ان کو ایک اضافی امتحان میں ڈال دیتے ہیں۔ یہاں کے پرنسپل محترم میجر (ر)

حفیظ اللہ خان نیازی صاحب تھے۔ ان کے دو تین بھائی مزید اس کام میں ان کے شریک ہیں۔ ان کے والد محترم عبد العزیز خان نیازی صاحب نے کئی برس قبل اس تعلیمی منصوبے کی بنیاد رکھی تھی اور اب ماشاء اللہ اب یہ ایک بہت بڑا ادارہ بن چکا تھا۔ یہ کافی بڑی عمارت تھی جس کی تین منزلیں اوپر اور اتنی ہی نیچے کی طرف بیسمنٹ میں بنی ہوئی تھیں کہ اوپر کی سمت زیادہ منزلوں کی تعمیر کی اجازت نہیں تھی۔ یہ بھی زندگی کا ایک سبق ہے۔ جب راستہ اوپر کی سمت میں رک جائے تو نیچے کی سمت نکال لینا چاہیے۔ اپنا سفر کبھی نہیں روکنا چاہیے۔

میجر صاحب نے بتایا کہ انھوں نے میری کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' گیارہ دفعہ پڑھ رکھی ہے۔ وہ عمرہ کر کے ابھی لوٹے تھے اور ماشاء اللہ بڑے دینی جذبے کے ساتھ بچوں کی کردار سازی کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ ادارہ چلا رہے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ پرائیویٹ سیکٹر کے بیشتر لوگ صرف کمانے کی غرض سے تعلیم کے شعبے میں آتے ہیں۔ ایسے میں لوگ کردار سازی کو اپنا مقصد بنالیں یہ بہت بڑی خدمت ہوگی۔

تقریر کے لیے طلبا نیچے بیسمنٹ میں موجود ہال میں جمع تھے۔ یہ ایک کافی بڑا ہال تھا جس میں کئی سو طلبا کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور ہال پورا بھرا ہوا تھا۔ جبکہ ایک بڑا اسٹیج بھی بنا ہوا تھا۔ میں نے آخرت کی حوالے سے پریزینٹیشن پیش کی جسے طلبا نے دلچسپی اور انہماک سے سنا۔ پروگرام کے بعد ہم واپس آفس آئے جہاں میجر صاحب کے اپنے خاندان کے کچھ بچے موجود تھے۔ میں نے ان سے فیڈ بیک لیا تو ان کو آج کی گفتگو پسند آئی تھی۔

یہاں سے سیدھا ہم طالبات کے کیمپس میں پہنچے۔ طالبات ایک بڑے ہال نما کمرے میں موجود تھیں۔ مگر طالبات کی تعداد کافی زیادہ تھی اس لیے ان کو نیچے زمین پر بٹھایا گیا تھا۔ البتہ خواتین اساتذہ پیچھے نشستوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے وہی پریزینٹیشن یہاں بھی پیش کی۔

جدید دور کے تقاضوں اور اسٹوڈنٹس کی نفسیات کا لحاظ کرتے ہوئے میں نے کل آئی ایم سائنسز میں اور یہاں بھی تقریر اور خطابت کے بجائے بے تکلفانہ گفتگو کے انداز میں اپنی بات طلبا کے سامنے رکھی تھی۔

بچیوں کا ردعمل ان کے چہرے پر پڑھا جا سکتا تھا۔ان کے لیے یہ ایک بالکل نئی چیز تھی۔ بلکہ شام میں ایک بچی اپنے والد ڈاکٹر نجیب صاحب کے ہمراہ ایک دوسرے پروگرام میں آئی۔اس کے والد بتا رہے تھے کہ یہ دوپہر گھر میں آئی تو میری تقریر سن کر ہوا میں اڑ رہی تھی۔تاہم شام کی تقریر سے بچی کو بہت مایوسی ہوئی۔ کیونکہ وہ ایک سنجیدہ علمی تقریر تھی۔جبکہ یہاں میرا انداز مکالمے اور گفتگو کا تھا۔

میری یہ پریزینٹیشن جس نے کل بھی اور آج بھی طلبا و طالبات کو مسحور کر لیا تھا دراصل میری کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کی مانند آخرت کی منظر کشی تھی۔وہ ناول کہانی کے قالب میں آخرت کو بیان کرتا ہے جبکہ اس میں تصویری انداز میں آخرت کے واقعات کو ایک منطقی ربط اور ترتیب کے ساتھ پیش کر کے آخرت کو ایک زندہ حقیقت کے طور پر پیش کرنے کی کوشش تھی۔

اہل وفا سے خطاب

یہاں سے فارغ ہو کر میجر صاحب کے ہاں پہنچے۔محترم شاہ خان صاحب بھی وہاں موجود تھی۔وہ میجر صاحب کے بہنوئی ہیں۔میجر صاحب نے از راہ عنایت پشاور کے مشہور چرسی چپلی کباب اور چرسی چپلی کڑھائی منگوائی تھی۔اس کی وجہ تسمیہ تو نہیں معلوم لیکن بہرحال یہ بہت عمدہ ڈش تھی۔

دوپہر میں مختصر آرام کے بعد شام میں دوبارہ "WAFA" نام کی ایک این جی او کے تحت ایک پروگرام تھے جو کہ قرطبہ یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔فدا کے ساتھ اب سکندر تنگی

صاحب بھی تشریف لا چکے تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ ہم قرطبہ یونیورسٹی پہنچے۔

''وفا'' جماعت اسلامی کے متعلقین کی ایک این جی او ہے جو معاشرے میں فلاح و بہبود کے کام کررہی ہے۔ یہاں میں نے ایک فکری گفتگو کی۔ اس میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ ایسا کیوں ہے کہ مسلمان دورِ جدید میں انسانی تاریخ کی سب سے بڑی مذہبی جدوجہد کرنے کے باوجود مسلسل ذلت و رسوائی کا شکار ہیں۔ اس کا سبب میں نے یہ بتایا کہ قرآن مجید مسلمانوں کے فکر و عمل کا محور نہیں رہا۔ لوگ قرآن نہیں پڑھتے۔ جو پڑھتے ہیں وہ سمجھتے نہیں۔ جو سمجھتے ہیں وہ اس کو میزان و فرقان مان کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ پروگرام کے بعد مغرب کی نماز ہوئی اور پھر سوال و جواب ہوئے۔

یہاں سے ہم سیدھا ایک جگہ ڈنر پر گئے۔ وہاں ''وفا'' سے تعلق رکھنے والے احباب جمع تھے جن کو میں نے ''اہل وفا'' کا نام دیا تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ مختلف معاملات پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔ بعض احباب کے کچھ اشکالات تھے جن کو میں نے دور کرنے کی کوشش کی۔ جماعت اسلامی کے احباب چونکہ تقلید سے عام طور پر اوپر اٹھ جاتے ہیں، اس لیے ان کی اکثریت سے گفتگو کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر معاملات میں ان سے ایک معقول مکالمہ کیا جا سکتا ہے۔

یہاں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ایک صاحب سے تعارف ہوا جن کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ میرا ناول پڑھنے کے بعد ڈپریشن کے مریض ہو چکے ہیں اور تین ماہرین نفسیات بدل چکے ہیں۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ کو سب سے پہلے مجھ سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔ پھر میں نے ان سے پریشانی کا سبب پوچھا تو انھوں نے وجہ آخرت کی گرفت کے اندیشے کو بطور سبب بیان کیا۔ میں نے ان سے چند موٹے موٹے گناہوں کے بارے میں پوچھا کہ آپ نے ان کا ارتکاب کیا ہے۔ پھر بنیادی نیکیوں کا پوچھا۔ ان کا جواب ایک صالح مسلمان کا جواب

تھا۔اس پر میں نے عرض کیا کہ یہ اگر عمل ہے تو پھر آپ کا رویہ اللہ سے بدگمانی کے مترادف ہے۔ آپ کو تو اللہ سے حسن ظن رکھنا چاہیے۔ وہ بڑی کریم ہستی ہیں۔انھوں نے واضح کر رکھا ہے کہ انسان بڑے گناہوں سے بچتا رہے تو چھوٹے موٹے گناہ وہ خود ہی معاف کر دیں گے۔ایسے کریم سے مایوس ہونا اس کی ناشکری اور وسوسہ شیطانی ہے۔

ہوم اکنامکس کالج

اس گفتگو کے دوران میں فدا نے صبح کے وقت ہوم اکنامکس کالج میں بھی ایک پروگرام طے کرلیا۔ یہ ڈاکٹر وقار صاحب کی درخواست پر ہوا تھا۔گرچہ اس روز مجھے واپس جانا تھا اور واپس ہونے سے قبل یہ پروگرام طے پایا تھا کہ احباب کچھ مقامی جگہیں مجھے دکھائیں گے،لیکن ابھی تک طلبا و طالبات کا جو ردعمل میں نے دیکھا تھا اس کی روشنی میں مجھے محسوس ہوا کہ طلباء تک بات پہنچانا زیادہ اہم ہے۔اس لیے میں نے فدا کو صبح کے وقت پروگرام طے کرنے کا کہہ دیا تھا۔

صبح سویرے فدا کے ساتھ سکندر تنگی صاحب اور اسلم میر صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ گاڑی سکندر صاحب ہی کی تھی اور ان کے ساتھ ہمیں آخر میں اسلام آباد لوٹنا تھا۔ پہلے ہم پشاور یونیورسٹی پہنچے اور وہاں سے ڈاکٹر سید وقار علی شاہ صاحب کو لے کر ہوم اکنامکس کالج گئے جو کہ سامنے ہی واقع تھا۔کالج وسیع رقبے پر قائم تھا اور عمارت بھی اچھی بنی ہوئی تھی۔ یہ پورا علاقہ ایک تعلیمی ٹاؤن ہی لگا جس کی عمارات بڑی کشادہ اور وسیع اور فراخ رقبہ ہر جگہ موجود تھا۔ ہوم اکنامکس کالج بھی ایسی ہی جگہ تھی۔ یہاں صرف طالبات ہی زیر تعلیم تھیں۔

کالج میں ہم سب پہنچے تو پرنسپل محترمہ سیدہ کنیز فاطمہ صاحبہ اور دیگر اساتذہ نے استقبال کیا۔ بعض اساتذہ نے میری تصنیفات پڑھ رکھی تھیں اور مجھ سے واقف تھیں۔ کچھ ابتدائی گفتگو کے بعد ہم ایک دوسرے کمرے میں گئے جہاں طالبات پہلے سے موجود تھیں۔ یہ غالباً ماسٹرز اور

پوسٹ گریجوایٹ کی طالبات تھیں۔ وقت چونکہ کم تھا اس لیے میں نے مختصراً گفتگو کی۔ میری گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ دور جدید میں کس طرح خواتین کے لیے عملی طور پر بہتر مواقع پیدا ہو چکے ہیں جو پہلے تاریخ میں کبھی نہیں ہوئے تھے اور تعلیم یافتہ خواتین کو یہ بات سمجھنا چاہیے۔اس کے بعد طالبات کوسوالات کا موقع دیا۔ایک سوال یہاں بھی پوچھا گیا اور پہلے بھی پوچھا گیا وہ یہ تھا کہ خود کشی کرنے والے کوسزا کیوں ملے گی کیونکہ اس کی تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ تقدیر میں وقت لکھا ہوتا ہے، موت کا طریقہ خود کشی کرنے والا چنتا ہے۔ اسے سزا اس طریقے کو اختیار کرنے کی ملے گی۔ بعد میں اس سوال کی وجہ یہ سمجھ میں آئی کہ اس علاقے میں کثرت سے خودکش حملے ہوئے ہیں اور احادیث میں اس کی سزا ابدی جہنم بیان ہوئی ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں کچھ لوگ بھونڈی تاویلات سے ان کی تائید اور توجیہہ بھی کرتے ہیں، اسی لیے شاید بچیوں کو ذہن میں یہ سوال تھا۔الحمدللہ یہ پروگرام بھی اچھا رہا۔

نوجوان اور دین کی دعوت

میں نے دو روز میں پشاور کے ان چار تعلیمی اداروں میں سیکڑوں طلباء و طالبات سے خطاب کیا۔ میں نے ان کو ایمان و اخلاق کی دعوت کا سب سے بہترین مخاطب پایا۔ اس سے قبل بھی کراچی میں بعض تعلیمی اداروں میں مجھے یہی تجربہ ہوا۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ نوجوانی کی عمر تک انسان کی فطرت مسخ نہیں ہوتی۔ اس پر دنیوی مصلحتیں، تعصّبات، خودساختہ نظریات غالب نہیں آتے۔ ایسے میں وہ عین فطرت پر کھڑے ہوتے ہیں۔ جبکہ ایمان واخلاق کی دعوت بھی عین فطری دعوت ہے۔ چنانچہ وہ اس دعوت کے بہترین مخاطب ثابت ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس عملی زندگی میں اتر جانے والے لوگ مفادات، خواہشات اور تعصّبات کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ یہ مذہب کی طرف آ جائیں تو ان پر اپنے نظریات غالب آ جاتے ہیں۔ ان

کو ایمان و اخلاق کی دعوت ایک چھوٹی بات لگنے لگتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اصل دعوت ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں وہ تمام انٹلکچول علمی اور فکری سفر کیے ہیں جو کوئی شخص آخری درجہ میں کرسکتا ہے۔ مذہب کے منکرین اور قائلین کا موقف، مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، اسلامی فرقوں اور فقہی مسالک کے باہمی اختلافات، غلبہ دین اور دعوت دین کے بارے میں فکری مباحث؛ غرض مذہب کی کون سی بحث ہے جس سے یہ خاکسار نہیں گزرا۔ ان سب سے گزر کر درست راستے کو ڈھونڈنا بہت مشکل کام ہے۔ لیکن اللہ نے اپنے فضل سے اس عاجز کو ان راستوں سے گزار دیا۔ ان سب سے گزر کر میری رائے یہ ہے کہ حق کے راستے میں علم کی وادی گرچہ بہت مشکل سہی لیکن اس میں وہی حیثیت رکھتی ہے جو تعلیمی نظام میں میٹرک، انٹر اور گریجویشن کی ہے۔ جبکہ ایمان و اخلاق کے مباحث اس راہ کے ماسٹرز اور پی ایچ ڈی ڈگریاں ہیں۔ ان کے تقاضے نبھانا اور ان میں مہارت پیدا کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ علم کی راہ کے اس پوسٹ گریجوایٹ اور پی ایچ ڈی کو کامیابی سے نبھانے کی صلاحیت سب سے بڑھ کر بچوں اور نوجوانوں میں پائی جاتی ہے۔

اسلامیہ کالج پشاور کا دورہ

اب ہماری روانگی تھی، مگر جانے سے قبل سکندر تنگی صاحب نے مجھے اسلامیہ کالج پشاور کی تاریخی عمارت دکھانا تھی۔ یہ کالج بیسویں صدی کے آغاز پر علی گڑھ تحریک سے متاثر ہو کر بنایا گیا تھا۔ اب تو یہ ایک یونیورسٹی بن چکا ہے لیکن تاریخی اہمیت کی بنا پر کالج کا لفظ اب بھی اس کے نام کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ ہزار روپے کے نوٹ پر جو تصویر اس وقت موجود ہے وہ اسی اسلامیہ کالج پشاور کی عمارت کی ہے۔ علامہ مشرقی جیسی نابغہ شخصیت اس کے پہلے وائس پرنسپل اور حساب کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قائد

اعظم نے اپنی جائیداد کا ایک تہائی اس کالج کو دینے کی وصیت لکھی تھی۔ وہ تین دفعہ اس یونیورسٹی کے دورے پر آئے اور آخری دفعہ قیام پاکستان کے بعد گورنر جنرل بننے کے بعد بھی یہاں آئے۔ علامہ اقبال نے بھی افغانستان جاتے ہوئے یہیں قیام کیا تھا۔

اس تاریخی اور اہم عمارت میں کافی دیر رہے اور مختلف حصوں کو دیکھا۔ یہاں لڑکیاں بھی زیر تعلیم ہیں۔ انھوں نے نیلے رنگ کا برقع پہن رکھا تھا۔ جبکہ طلبہ نے سفید شلوار قمیض کے ساتھ سیاہ رنگ کی شیروانی زیب تن کر رکھی تھی۔ سکندر تنگی صاحب نے مجھے یہ دکھاتے ہوئے کہا کہ آپ لوگوں نے شیروانی چھوڑ دی اور ہم نے ابھی تک اختیار کر رکھی ہے۔ یہ شیروانی واقعی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ یہ یونیفارم غالباً علی گڑھ تحریک سے وابستگی کا اظہار تھا۔

مثبت سوچ اور منفی سوچ

علی گڑھ تحریک سرسید کی اس رہنمائی کا نتیجہ تھی جو 1857 کے تباہ کن سانحے کے بعد مسلمانوں کے لیے امید کی ایک کرن کے طور پر ظاہر ہوئی تھی۔ سرسید کے بعض مذہبی افکار سے قطع نظر، ان کی علی گڑھ تحریک انیسویں صدی کے مسلمانوں کے لیے اندھیرے میں امید کی ایک شمع تھی۔ اس تحریک نے مسلمانوں کو ٹکراؤ سے ہٹا کر ایک مثبت میدان عمل فراہم کیا۔ درحقیقت یہی وہ تعلیمی تحریک تھی جس نے آگے جا کر قیام پاکستان کی راہ ہموار کی۔ سیاست کے علاوہ اس تحریک کا ایک بڑا اہم پہلو اردو زبان کو جدید اردو زبان میں تبدیل کرنا تھا۔

بدقسمتی سے سرسید کی یہ مثبت سوچ جو بدترین حالات میں بھی ایک مثبت لائحہ عمل دریافت کرنے کے اصول پر مبنی تھی ہمارے معاشرے میں عام نہیں ہوسکی۔ جو ممکن نہیں ہے اس کو چھوڑ کر ممکن پر اپنی توجہ مبذول کرنے کے بجائے بتدریج ہمارے ہاں جذباتیت، ٹکراؤ، تصادم، ایجی ٹیشن کی نفسیات غالب آتی چلی گئی۔

علی گڑھ تحریک کے نتیجے میں آخرکار پاکستان بن تو گیا۔مگر ہماری فکری قیادت نے اس عظیم موقع کو ضائع کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہماری فکری قیادت کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اس عظیم موقع کو محسوس کرتے اور قوم کی اخلاقی تربیت کرتے۔اس کے اداروں کو مضبوط بناتے۔ خطے میں امن کی فضا قائم کرنے کی کوشش کرتے۔عوام کو سہولیات کی فراہمی کو اصل مسئلہ بناتے ۔مگر افسوس منفی سوچ، نفرت، جھگڑے کی نفسیات نے پوری قوم کو تباہی کے دہانے پر پہنچادیا۔

پشاور اور خیبر پختونخواہ کا صوبہ اس کا ایک عملی اظہار ہے کہ ہم کیسے عظیم واقعے کو اس نفسیات کی بنا پر ضائع کردیتے ہیں۔ایران میں احمدی نژاد کو تہران اور ترکی میں طیب اردگان کو استنبول کا مئیر بننے کا موقع ملا۔ان دونوں نے اس موقع کو استعمال کیا اور ان کو اس درجہ پر پہنچادیا کہ لوگوں نے ان کو پورے ملک کی صدارت دے دی۔تحریک انصاف پچھلے چار برس سے اس صوبے پر حکمران ہے۔مگر یہ شہر ابھی تک کوئی مثالی ماڈل نہیں بن سکا۔پچھلے برس میں سوات میں تھا تو وہاں یہ سوچ کر صبر کرلیا تھا کہ چلو دور دراز علاقے شاید ترقی کی لہر سے دور ہیں، مگر عین پشاور میں اگر ترقی نہیں ہو رہی تھی، اس کا کیا عذر پیش کیا جاسکتا ہے؟

میں نے اس حوالے سے مقامی لوگوں سے بات کی تو انھوں نے کہا تعلیم، صحت اور پولیس کے شعبے میں بہتری آئی ہے۔ایسا ہوا ہے تو یقیناً یہ بہت اچھی بات ہے۔ اس کی تحسین کرنا چاہیے۔لیکن سوال یہ ہے کہ باقی کام کرنے سے آپ کے ہاتھ کس نے باندھ رکھے ہیں؟

میں پشاور ائیر پورٹ پر اترا اور اس سے باہر نکلا تو ٹریفک جام اور بے ہنگم ٹریفک کا منظر سامنے تھا۔اس کے برعکس آپ لاہور ائیر پورٹ سے جیسے ہی باہر نکلیں گے ایک جدید شہر سامنے آجائے گا۔مگر اٹھارہویں ترمیم کے بعد ملنے والے بہت سارے مالی مسائل اور ضرب عضب

کے بعد قائم ہونے والے امن کے باوجود پشاور ایک قابل رحم شہر کے طور پر سامنے آیا۔ تحریک انصاف کی قیادت اگر دیگر ریفارمز کے ساتھ شہری ترقی کو بھی اپنا ہدف بناتی تو 2018 کے الیکشن میں ملک بھر میں دیگر سیاسی جماعتوں کی شکست یقینی تھی۔ کیونکہ ان کے لیڈروں کے مقابلے میں عمران خان کی ساکھ بہت زیادہ تھی۔

مگر بدقسمتی سے تحریک انصاف کی قیادت کے ذہن میں یہ بات سوار ہوچکی ہے کہ نواز شریف کو اقتدار سے ہٹانا ہے۔ یہ لوگ اتنی سادہ سی بات نہیں سمجھتے کہ وہ جائیں گے تو ان کی بیٹی مریم نواز آجائے گی۔ پھر لوگ ان کی بیٹی کو اسی طرح ووٹ دیں گے۔ نواز شریف اور دیگر سیاسی جماعتوں کو شکست دینے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ وہ یہ کہ پشاور کو ایک بہترین صوبہ بنا کر دکھا دیا جاتا۔ مگر اس کے لیے صبر، منفی سوچ سے نجات، نہ ملنے والی چیز کو بھولنے اور ممکنہ مواقع کو دیکھنے والے مثبت انداز فکر کی ضرورت تھی۔ مگر لوگ ان چیزوں سے واقف ہی نہیں۔ اس لیے اب تمام قرائن سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ اگر کوئی بہت بڑی تبدیلی نہیں ہوئی تو عمران خان مرکز میں نہیں آسکیں گے۔ یہ ایک بہت بڑا سانحہ ہوگا۔ کیونکہ اگلے پانچ برسوں میں عمران کی عمر بہت زیادہ ہوچکی ہوگی۔ ان کی پارٹی ان کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ جس کے بعد مسلم لیگ کو ملنے والا چیلنج ختم ہوجائے گا اور پھر اس کی قیمت پاکستانی عوام کو دینا پڑے گی۔

عمران خان اس قوم کا ایک سرمایہ ہیں۔ مگر ان کو مثبت سوچ کی ضرورت ہے۔ مثبت سوچ یہ ہے کہ جو نہیں ملا اس کو چھوڑ دیں اور جو ممکن ہے وہ کام کریں۔ ابھی بھی اگر ایک برس میں یہ تہیہ کرلیا جائے کہ خیبر پختونخواہ کو بدلنا ہے تو کچھ نہ کچھ بہتری ہوسکتی ہے۔ ورنہ پاکستانی عوام کو معلوم ہے کہ کون کتنا کرپٹ ہے۔ مگر چونکہ قوم ہی کرپٹ ہے اس لیے اسے کرپٹ حکمرانوں سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ انھیں فرق اس سے پڑے گا کہ کون زیادہ اچھے کام کررہا ہے۔ کاش یہ

بات کچھ لوگ سمجھ سکیں۔

دریائے کابل اور بند کشتی

پشاور سے جاتے ہوئے شاہ خان صاحب کے دفتر گئے۔ وہ بہت مصروف تھے، مگر بڑی محبت کے ساتھ ملے۔ وہیں سے سمیع اللہ جان صاحب کو ساتھ لیا اور پھر پانچ افراد کا یہ قافلہ مجھے اسلام آباد چھوڑنے کے لیے روانہ ہوا۔ سکندر تنگی صاحب ڈرائیونگ کر رہے تھے۔ میں ان کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا تھا جبکہ سمیع اللہ جان صاحب، اسلم میر صاحب اور فداء الرحمٰن صاحب پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم چارسدہ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں دریائے کابل پر رکے۔ یہ ایک تفریحی اسپاٹ تھا لیکن سردی کی وجہ سے زیادہ لوگ نہ تھے۔ ہمارے ساتھیوں نے کشتی میں بیٹھنے کا ارادہ کیا۔

احباب کے اصرار پر کشتی والا ہمیں آگے تک لے گیا۔ مگر وہاں بیچ دریا میں کشتی بند ہوگئی۔ ویسے بھی میں نے یہ بات نوٹ کی تھی پانی کشتی سے بمشکل ایک آدھ بالشت ہی نیچے تھا۔ اس طرح کی کشتی تیز رفتاری سے موڑ کاٹے اور وزن زیادہ ہو تو کشتی ڈوب جایا کرتی ہے۔ اسی روز رات کو ہم نے خبروں میں سنا کہ دریائے راوی میں ایک کشتی ڈوبنے سے درجنوں لوگ ڈوب گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں کشتی میں لائف جیکٹ کا کوئی تصور نہیں۔ جبکہ ملک سے باہر لائف جیکٹ کے بغیر اس طرح کے ایڈوانچر کا کوئی تصور نہیں ہوسکتا۔ تاہم یہ پاکستان ہے۔ غربت اور جہالت کا آمیزہ جہاں انسانی جان سب سے بے وقعت چیز ہے۔

اللہ کا شکر تھا کہ موبائل فون سے ساحل سے رابطہ قائم کر کے مدد طلب کی گئی۔ اسی دوران میں ہم کشتی سے دریا پر بنے ایک جزیرے میں اتر گئے۔ دوسرا بندہ پٹرول لے کر آیا تو ہماری کشتی دوبارہ روانہ ہوئی۔ ساحل پر پہنچ کر ہم نے دوپہر کے کھانے میں چائنیز مچھلی کھائی۔ اس کی وجہ

تسمیہ سمیع اللہ جان صاحب نے یہ بتائی کہ اس مچھلی کی شکل چائنیز لوگوں سے ملتی ہے اس لیے یہ چائنیز مچھلی کہلاتی ہے۔

ادھوری کہانی

اسلام آباد تک کا دو گھنٹے کا راستہ ان دوستوں کی رفاقت میں پتہ ہی نہیں چلا۔ راستے بھر میں ان لوگوں سے ان کی زندگی کے احوال سنتا رہا۔ ہر شخص کی زندگی اپنے اندر ایک بڑی داستان رکھتی ہے۔ ان لوگوں نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا اس سے اندازہ ہوا کہ انسان جب سچائی کے سفر پر نکلتا ہے تو کہیں نہ کہیں سے اللہ تعالیٰ صحیح بات اس تک پہنچا دیتے ہیں۔ انسان سچ کی تلاش کو اپنا مسئلہ نہ بنائے تو زندگی ایسے ہی عالم جمود میں گزر جاتی ہے۔

سکندر تنگی صاحب نے شادی نہیں کی تھی۔ اگرچہ وہ ماشاءاللہ بڑے خوش شکل نوجوان تھے۔ میں نے ان کی توجہ دلائی کہ اللہ کی کسی ایسی بندی پر جو کہیں ان کے لیے بنائی گئی ہے، وہ یہ ستم کیوں ڈھا رہے ہیں کہ ابھی تک شادی سے انکاری ہیں۔ وہ ہر دفعہ بات گھما گئے البتہ مجھ سے یہ فرمائش کی کہ میں اس دفعہ جو ناول لکھنے اسلام آباد جا رہا ہوں وہ ایک رومانٹک ناول ہونا چاہیے۔ ان کی دلداری کے لیے میں نے یہ ہامی بھر لی۔ چنانچہ جب زندگی شروع ہوگی کی کہانی کا یہ جو چوتھا اور آخری حصہ ہے، وہ جتنا کچھ بھی رومانٹک ہوگا اس کی ذمہ داری سکندر تنگی صاحب کے سر ہوگی۔

خیر یہ بات تو از راہ تفنن میں نے کہی ہے، لیکن اس نئے ناول میں میرے مخاطب صرف نوجوان بچے اور بچیاں ہی ہیں۔ میں نے پشاور میں جن سیکڑوں یا شاید ہزاروں طلباء سے خطاب کیا، آخرت کے ذکر پر ان کی آنکھوں میں میں نے ہمیشہ ایک چمک دیکھی۔ مجھے اس چمک کو بڑھانے کے لیے اُس زندگی کا مزید نقشہ کھولنا ہے۔ خوابوں کی اس بستی کا جس کا نام فردوس بریں ہے۔ جہاں ہر ادھوری کہانی پوری کی جائے گی۔ پھر یہ بھی مجھے بتانا ہے کہ اس بستی تک پہنچنے کے

آسان ترین راستے کیا ہیں۔

خدا نے یہ دنیا امتحان کے لیے بنائی ہے۔ یہ صرف امتحان کے پہلو سے پوری ہے اور باقی ہر پہلو سے ادھوری ہے۔ یہاں ہر کہانی آخر کار ادھوری رہ جاتی ہے۔ وہ دنیا آ گے آ رہی ہے جہاں ہر ادھوری کہانی پوری کی جائے گی۔ اسی دنیا کا تعارف کرانا میرے پیش نظر ہے۔ اس میں ظاہر ہے کہ ان سارے سوالات کا جواب بھی میں دینے کی کوشش کروں گا جو لوگ بار بار مختلف حوالوں سے اُس آنے والی دنیا کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ وہاں کے عقدہ لاینحل کیسے حل ہوں گے۔ ناممکن کیسے ممکن ہو جائے گا۔ عام انسان کیسے اعلیٰ انسانوں میں بدل جائیں گے۔ انسان اُس لامحدود دنیا میں کیا کریں گے۔ خدا اور انسان کے تعلق کی نوعیت کیا ہو جائے گی۔ یہ سب اس نئے ناول کا موضوع ہے۔

خیر ہم لوگ باتیں کرتے ہوئے، راستے میں رک کر نمازیں پڑھتے، چائے پیتے ہوئے اسلام آباد پہنچے۔ یہاں برادرم سلیم صافی صاحب سے ان کے دفتر میں ملاقات کی۔ کئی برس بعد ان سے ملاقات ہوئی اور مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میں نے کوشش کی کہ موجودہ ملکی صورتحال پر ان کا نقطہ نظر سمجھوں۔ وہ باخبر صحافی اور تجزیہ کار ہیں اور اپنا ایک خاص زاویہ نظر رکھتے ہیں۔ ان سے بات کر کے سیاسی معاملات کو دیکھنے کا ایک مختلف زاویہ ملا۔

یہاں سے فارغ ہو کر ان دوستوں کے ساتھ ایک قریبی ریسٹورنٹ میں رات کا کھانا کھایا اور یہ احباب مجھے میرے میزبان ندیم اعظم صاحب کے حوالے کر کے واپس پشاور جانے کیلئے رخصت ہو گئے۔ ان لوگوں سے ملنے والی محبت اور ان کے ساتھ گزارا ہوا وقت بلاشبہ زندگی کی ایک خوبصورت یاد اور سرمایہ ہے۔

پروین سلطانہ حنا

یہاں غم نہ کرنا

یہاں چلتے چلتے اچانک ہی ملنا یہاں ملتے ملتے اچانک بچھڑنا
یہاں پاکے کھونا یہاں کھوکے پانا بہت عارضی ہے یہاں غم نہ کرنا
نہ غم ہی رہیں گے، نہ ہم ہی رہیں گے نہ دنیا کے ظلم و ستم ہی رہیں گے
یہاں غم نہ کرنا، وہاں ہم ملیں گے

جہاں زندگی میں کمی کچھ نہ ہو گی جہاں وقت ہم کو جدا نہ کرے گا
جہاں زندگی میں کوئی غم نہ ہو گا کسی کے بچھڑنے کا ماتم نہ ہو گا
یہاں غم نہ کرنا، وہاں ہم ملیں گے

جہاں خو شبوؤں کا بسیرا رہے گا جہاں ماہِ تاباں کی ٹھنڈک رہے گی
جہاں کہکشاؤں کا ڈیرا رہے گا جہاں روشنی کا سویرا رہے گا
یہاں غم نہ کرنا، وہاں ہم ملیں گے

جہاں پا کے کھونے کا ڈر نہ رہے گا کوئی بے سکوں دربدر نہ رہے گا
جہاں موت کا شائبہ تک نہ ہو گا جہاں زندگی بھی ہمیشہ رہے گی
جہاں ہر گھڑی لذت جام ہو گی صبح زندگی کی نہ پھر شام ہو گی
یہاں غم نہ کرنا، وہاں ہم ملیں گے

ابو یحییٰ کی کتابیں

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

حکمت کی باتیں

حکمت کی وہ باتیں جو دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضامن ہیں

ملاقات

اہم علمی، اصلاحی، اجتماعی معاملات پر ابو یحییٰ کی ایک نئی فکر انگیز کتاب

کھول آنکھ زمین دیکھ

مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا سفرنامہ

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ابو یحییٰ کی شہرہ آفاق کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کا دوسرا حصہ

Please visit this link to read all articles and books of Abu Yahya free online.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

Monthly
INZAAR
APR 2017
Vol. 05, No. 04
Regd. No. MC-1380
Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,
25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi